ادب لطیف

جلد ۴۴ ——— فون ۲۰۰۹ ——— شمارہ ۵ ۶

بانی چودھری برکت علی مرحوم

نومبر ۵۷ء

ماہنامہ

ادبِ لطیف

لاہور

مرتب :- میرزا ادیب

مینیجنگ ایڈیٹر :- افتخار علی چودھری

زرِ سالانہ

پاکستان میں ——— ۸/- روپے

غیر ممالک میں ——— ۱۲/- روپے

فی کاپی ۱۰ آنے

منظور شدہ برائے مدارس کراچی و مغربی پاکستان بموجب سرکلر نمبر

۵۴/۵۲۱/۵۳۵۰۶ مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۴ء و ۲۷۷۶۷ مورخہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۴ء ۔۔۔ بموجب

سرکلر نمبر ۱۵۴۴ مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۵۵ء

مکتبہ اردو لاہور

:- چودھری افتخار علی پرنٹر پبلشر نے اردو پریس لاہور سے چھپوا کر مکتبہ اردو لاہور سے شائع کیا۔

ترتیب

آغاز پیرایۂ

مرتّب

ادبِ لطیف کے اس شمارے میں ایک بڑا اہم مقالہ شریکِ اشاعت ہے جس میں فاضل مقالہ نگار نے ——— اس میلان کو خطرناک قرار دیا ہے جو بعض غزل گو شعراء کے ہاں میر تقی کے زیرِ اثر مریضانہ داخلیت پسندی کی شکل میں بروئے کار آ رہا ہے اور جسے بہرحال ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ مقالہ نگار کو میر کی بعض خصوصیات کا پورا پورا اعتراف ہے اور اگر ان خصوصیات — مثلاً میر کی انسانیت دوستی۔ میر کے ہاں الفاظ کی موزونیت، میر کی پرکار سادگی ——— کی تقلید کی جائے تو یہ رجحان بڑا قابلِ قدر ہوگا — خطرناک رجحان اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہمارے بعض جدید غزل گو میر کے ایک خاص رنگ افسردگی و پژمردگی کو اپنا کر متاعِ اشک و آہ، کو اپنا شعری سرمایہ بنا لیتے ہیں اور زندگی کے سنگین حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی بجائے خود ساختہ اضمحلال کا شاہکار ہو کر رہ جاتے ہیں!

اپنے اس مقالے میں ڈاکٹر محمد حسن نے جو کچھ کہا ہے وہ بہت معقول ہے — ہمیں یہاں صرف دو ایک باتوں کی طرف اشارہ کرنا ہے اور ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں:۔

میر پر داخلیت پسندی کا الزام لگایا گیا ہے اور کہا یہ گیا ہے کہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر پائیں باغ کی کھڑکی بھی نہیں کھولتا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ میر کے عہد کے حالات و کوائف کی جھلکیاں جس قدر میر کے کلام میں نظر آتی ہیں اس کے کسی بھی ہمعصر شاعر میں دکھائی نہیں دیتیں۔ غزل کی زبان رمز و کنایہ کی زبان ہے اس لیے میر نے جو کچھ کہا ہے، "رموز و علائم" کے انداز میں کہا ہے۔ جس چیز کو اس کی ماتمیہ لے کہا جاتا ہے وہ دراصل اس کے اپنے زمانے کی بھرپور آواز ہے اس کا دُکھ درد ——— شخصی ہونے کے باوجود آفاقی بن گیا ہے۔ اگر میر کو اس کے دور سے الگ کر کے دیکھا جائے تو اس کے ہاں مریضانہ داخلیت پسندی کا الزام درست ہو سکتا ہے لیکن جب اس کے دَور کے مخصوص تقاضوں اور غزل کے مروجہ اسلوب کو سامنے رکھ کر میر کی شاعری کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے تو ہمیں اس کے یہاں داخلیت اور خارجیت میں بہت کم فرق نظر آتا ہے۔ اب اگر کوئی شاعر ناپختگی شعور کی وجہ سے ماتمی لے بلند کر کے میر کی لفظیات کو اوڑھنا بچھونا بنا لیتا ہے تو اس میں میر کا کیا قصور ہے اور میر پر کیونکر مریضانہ داخلیت پسندی کا الزام لگایا جا سکتا ہے، ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ جو لوگ بزعم خویش میر کا انداز اپنانے کی کوشش کرتے ہیں، انھوں نے میر کو صحیح معنوں میں سمجھا ہی نہیں۔ نہ یہ میر کرنے سے یا آدمے ہے، جاتی ہے، کی سی ردیفیں استعمال کرنے سے میر کی تقلید نہیں ہو سکتی یہ تو محض اپنی ذہنی ناپختگی کا ثبوت بہم پہنچانا ہے، مشکل یہ ہے کہ میر کے کلام کا مطالعہ ہی نہیں کیا گیا، میر کو سمجھنے کے لیے اس کے بیشتر کلام کے مطالعے کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان معاشی، عمرانی اور مجلسی عناصر کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے جن سے اس کا ماحول ترتیب پاتا ہے۔

ہمیں تو اس بات پر اتفاق نہیں ہے کہ میر کی تقلید ہو رہی ہے، بہرحال یہ موضوع بہت اہم ہے، کیا ہمارے پڑھنے والے اس پر غور کریں گے ——؟

○

ایک خطرناک میلان

ڈاکٹر محمد حسن

(ڈاکٹر محمد حسن کا یہ مقالہ چند ماہ پیشتر ہمیں ملا تھا۔ ہمیں افسوس ہے کہ اسے قدرے تاخیر سے شائع کر رہے ہیں۔
مقالہ نہایت اہم ہے —— توقع ہے ہمارے پڑھنے والے اسے خاص توجہ سے پڑھیں گے۔) (مرتب)

آج کی اردو شاعری پر ایک نیا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ یہ خطرہ نہ ادبی جمود کا ہے نہ ترقی پسندی کا، یہ خطرہ دراصل مریضانہ داخلیت کے نئے رجحان سے پیدا ہوا ہے جو ادب کے لئے بڑا خطرہ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ عارضی کیفیت ہوتی ہے اور ادب "دم لے کر" پھر آگے بڑھ جاتا ہے۔ رہی ترقی پسندی سو اس کی عصبیت اور تنگ نظری کا دور اب ختم ہو چکا ہے۔ خود ترقی پسند تحریک ماضی کا جزو بن چکی ہے۔ آج ہمارے شاعروں کے لئے ہنگامی موضوعات کی دلکشی حیرت ناک طور پر کم ہو گئی ہے۔ نہ ہر شاعر تخفیفِ اسلحہ کی کانفرنس پر نظمیں کہہ رہا ہے نہ اس "ارضِ سرخ" کے خواب دیکھ رہا ہے جسے کبھی ستارے سلام کرتے تھے، نہ کیرل میں نئی اشتراکی حکومت کے قیام کو موضوعِ سخن بنایا جا رہا ہے نہ خروشچیف اور بلگانن کو وہ ادبی اہمیت حاصل ہوئی ہے جو کبھی اسٹالن کو مل گئی تھی۔ یاد ہے تلنگانہ کی معمولی تحریک پر اردو میں رپورتاژ، ناول، نظم اور افسانوں کا اچھا خاصا ذخیرہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ لیکن کیرل میں دنیا کی پہلی آئینی اشتراکی وزارت کے قیام پر کوئی ادبی ہنگامہ برپا نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ ترقی پسند تحریک کا نعرہ بازی کا دور ختم ہو گیا ہے۔

ترقی پسند تحریک ختم ہو گئی اس کی افراط و تفریط بھی اس کے ساتھ ختم، یہ باتیں ایک حد تک ہمارے ادب کی ذہنی بلوغت کا پتہ دیتی ہیں۔ لیکن جو لوگ آج بھی ترقی پسندی پر جا و بیجا حملہ کرنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں وہ مُردے پر سو دُرّے لگانے کے قائل ہیں اور ان لوگوں میں اکثر وہ لوگ ہیں جو ترقی پسندی کی افراط و تفریط میں بھی اسی شد و مد سے شریک رہے تھے۔

ترقی پسند تحریک کی بے راہ روی کے بعد ہمارے ادیبوں پر ایک نئی ذمہ داری آئی تھی، گروہ بازی، پارٹی بازی اور محدود عقیدے کے دائرے سے نکل کر زندگی کے مسائل پر خود غور کرنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کا وقت آیا تھا۔ اب صداقت کی سچی دریافت کا زمانہ آیا تھا۔

ترقی پسند تحریک نے بڑے مسائل پر مربوط انداز میں سوچنا سکھایا تھا۔ اس کی ناکامی سے نئی نسل کو یہ سبق لینا چاہیئے تھا کہ بڑے مسائل پر چھوٹے دائروں میں رہ کر نہیں سوچا جا سکتا ہے اور پارٹی کی مصلحتوں اور بندھے تصورات سے آگے بڑھ کر انہیں خود اپنی فکر کی رہبری میں صداقت تک پہنچنا چاہیئے، اب وقت تھا کہ ہمارے ادب میں بھی ژید، ایلیٹ، مالرو، سارترے جیسے ادیب پیدا ہوتے۔

لیکن اس کے برخلاف ترقی پسند تحریک کی ناکامی سے ہماری نئی نسل نے دوسرا نتیجہ نکالا، اس نے ترقی پسند تحریک کے حل کو غلط سمجھنے کے ساتھ ساتھ بڑے مسائل پر غور کرنے کو بھی غلط سمجھا۔ ترقی پسند تحریک نے ایک عرصے تک ذہنوں کو ایک خاص عقیدے کے سانچے میں سوچنے کا عادی بنا دیا تھا۔ نئی نسل میں اتنا دم نہیں تھا کہ وہ فکر کے بنے بنائے فارمولوں سے الگ ہٹ کر سوچ سکتے۔ وہ مارکسیت یا اسلام یا کسی اور مفارمولے کا دم بھرے بغیر صرف اپنی فکر و نظر کے بھروسے سوچنے کی جسارت نہ پاتے تھے۔ اس لئے عظیم مسائل سے دامن بچا کر انہوں نے فکر سے فرار ہی کو بہتر سمجھا، اور مریضانہ داخلیت کے شکار ہو گئے۔

آخر ترقی پسند تحریک کی بنیادی کمزوریاں کیا تھیں؟

پہلی بات یہ ہے کہ ترقی پسندی نے سماجی شعور پر ضرورت سے زیادہ زور دیا اور داخلیت اور انفرادی جذبے کو سرے سے نظر انداز ہی کر دیا۔ ادب سے میکانکی افادیت کا تقاضا کیا جانے لگا۔ یہ ضروری سمجھا گیا کہ ادب سماج کے مسائل کا فوری حل پیش کرے، سماجی شعور سے یہ مراد لی گئی کہ شاعر اور ادیب کو اپنے دور کے ہنگامی حالات سے فوراً متاثر ہونا چاہیئے اور ان کے بارے میں لائحہ عمل پیش کرنا چاہیئے۔ ذمہ دار نقادوں نے یہ فلسفہ بڑے شد و مد سے پیش کیا کہ ہر ادیب چونکہ پہلے انسان ہوتا ہے اور بعد کو کچھ اور اس لئے ان سارے مسائل سے براہِ راست اثر لینا اس کے لئے ضروری ہے جو اس دور کے انسانوں کو متاثر کریں مثلاً ۱۹۴۲ء میں قحطِ بنگال ۱۹۴۵ء میں گاندھی جناح ملاقات اور ۱۹۵۰ء میں عالمگیر امن کی تحریک پر کچھ نہ کچھ لکھنا ادیبوں کا فرض قرار دیا جانے لگا۔

اس کا انجام یہ ہوا کہ "سماجی شعور" کا لفظ ہنگامی حالات سے اثر پذیری کے مفہوم میں استعمال کیا جانے لگا اور ہنگامی حالات کے حل اکثر سیاسی جماعتوں ہی کے پاس ہوتے ہیں، اس لئے ادیب کو سیاسی مبلغ کے روپ میں سامنے آنا پڑا۔ سماجی شعور اس طرح صحافت اور سیاسی پرچار کا مترادف قرار پایا اور ادبی تخلیق کا عمل بالکل میکانکی اور مبلغانہ ہو کر رہ گیا۔

اس سے ادیبوں کا جلد یا بدیر عاجز آنا بالکل قدرتی بات تھی، کیوں کہ اس فلسفے نے ان سے ادب کی بنیادی آزادی یعنی آزادیٔ احساس چھین لی تھی۔ انہیں بتایا جاتا تھا۔ کہ اس دور کی اہم ترین حقیقت کیا ہے اور انہیں اس کے بارے میں کیا محسوس کرنا چاہیئے۔ اس قید و بند کے خلاف شدید ردِ عمل شروع ہوا اور اس کے نتیجہ کے طور پر ہمارے شاعروں اور ادیبوں میں سخت داخلیت کا رجحان پیدا ہوا۔ وہ خود محسوس کرنا چاہتے تھے اور وہی لکھنا چاہتے تھے جو انہوں نے محسوس کیا ہے۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ ہمارے شاعر اور ادیب عمرانی زندگی اور اس کے مسائل پر اپنے دماغ سے غور کرتے، اسے اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور اپنے کانوں سے اس کی صدا سنتے اور اوپر سے لادے ہوتے نظریات کو نظر انداز کر کے خود کسی نتیجے تک پہنچتے، اس کے بجائے ہوا یہ کہ ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے کچھ فکر کی محنت سے گھبرا کر کچھ خیالات کے انتشار سے عاجز آ کر عمرانی زندگی کے مسائل پر سوچنے ہی سے پرہیز کیا۔ انہوں نے اپنے احساسات اور افکار کا دائرہ زیادہ وسیع اور حقیقی بنانے کی بجائے اسے بہت محدود کر لیا۔

انہیں ایسے دائرے کی تلاش تھی جہاں ان کے بیانات کی صداقت کو جھٹلایا نہ جا سکے۔ جہاں ان پر غیر سائنٹیفک اور "غیر ترقی پسند" بات کہنے کا الزام نہ لگایا جا سکے۔ جہاں ان کے خیال کو سچ یا جھوٹ نہ بتایا جا سکے۔ اگر شاعر ترقی پسندوں کی سرکاری پالیسی کے ماتحت نظم نہیں لکھتا بلکہ اسی موضوع پر اس پالیسی سے الگ مختلف خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ تو اس کا اندیشہ تھا کہ اس کے خیالات پر سخت اعتراض کئے جائیں اور اس کا تخلیقی فن پارہ اسی کی نذر ہو جائے۔ اس کا علاج خصوصاً ہمارے شاعروں نے یہ نکالا کہ زندگی، سوسائٹی، ارتقا اور عمرانی موضوعات کے بارے میں کچھ نہ کہا جائے، اور اگر کہا جائے تو غزل کی زبان میں اشاروں، کنایوں اور استعاروں میں کہا جائے جس سے ہر قسم کے معانی برآمد کئے جا سکتے ہیں۔

غزل کی طرف رجحان دراصل فکر سے فرار کا نتیجہ ہے، وہاں استعارے سے رخِ محبوب بھی مراد لیا جا سکتا ہے اور برطانوی سامراج بھی اور اس ابہام کو جان بوجھ کر ہمارے شاعروں نے پناہ گاہ کے طور پر استعمال کیا۔ نظم میں اس رجحان نے یہ صورت اختیار کی کہ

خارجی اور تہذیبی موضوعات کو چھوڑ کر ہمارے شعراء داخلیت کے دائرے میں گھر کر رہ گئے۔ وہ آپ بیتی کہتے تھے اور خود کلامی کا انداز ان کا محبوب انداز تھا اپنے گھر کی باتیں، اپنے محبوب کی باتیں کچھ نیم افسردہ یادیں، کچھ مضمحل عزائم اور کچھ سسکتے ہوئے ارمان۔ یہ افسردہ یادیں، مضمحل عزائم اور شکست خوردگی اکثر حالات میں بناوٹی اور جھوٹی ہوتی ہے۔ ترقی پسند شاعری نے خارجیت پر زور دیا تھا اور اس میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے رجائیت، امید اور رامنگ کے ساتھ ساتھ خطابت کی شان اور زورِ بیان قائم رکھا تھا، اس کے ردِ عمل کے طور پر نئے دور کے شعراء نے داخلیت پر زور دیا اور داخلیت میں تاثیر کا جادو جگانے کے لئے افسردگی، نامرادی اور ماتمیہ عناصر اکثر استعمال کئے جاتے رہے ہیں۔ لکھنو اسکول کے آخری دور میں سوز و گداز کا یہ نقلی احساس پیدا کرنے کے لئے میت۔ قبر، کفن اور موت کے جملہ لوازم خوب استعمال کئے گئے۔ تاثیر اور ہمدردی جگانے کا وہی نسخہ نئی نسل استعمال کر رہی ہے۔ رجائیت، امید اور امنگ کے برعکس افسردگی، نامرادی اور اضمحلال کو نئی شاعری نے اپنا نشان بنا لیا ہے۔

ایسی حالت میں غالبؔ کی مقبولیت کا کم ہونا اور میرؔ کی طرف رجعت کچھ تعجب خیز نہیں ہے۔ غالبؔ خیالات کا مجموعہ ہے۔ میرؔ احساسات کا۔ غالبؔ فکر کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھتا۔ میرؔ کی متاع اشک و آہ ہے۔ غالبؔ کی داخلیت خارجی آہنگ سے معمور ہے۔ میرؔ نے اپنا دریچہ اکثر پائیں باغ میں بھی نہیں کھلنے دیا ہے۔ میرؔ کے بڑے کارنامے بھی ہیں۔ لیکن نئی نسل نے انہیں جس طرح اپنایا ہے۔ وہ میرؔ کے لئے بھی خطرناک ہے۔ اور اپنانے والوں کے لئے بھی، اس اندھی تقلید کی انتہا یہ ہے کہ میرؔ کے گھٹیا اشعار کو بھی ایسے دقیق معنے پہنائے گئے کہ ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری کی یاد تازہ ہوگئی۔ ایک عزیز دوست نے کلیاتِ میرؔ کو ایک ناول کی حیثیت سے پڑھنے کا اعلان کر دیا، ایک دوسرے بزرگ نے انہیں واسوخت۔ مثلث۔ مربع اور تضمین کا "موجد" قرار دے دیا اور بتایا، کہ انہوں نے ایسی بے شمار تنقیدی اصطلاحات وضع کی ہیں۔ جو آج مغرب کے کسی بڑے نقاد کے سوا شاید مشکل ہی سے کہیں ملیں" ایک صاحب کو میرؔ کے اس شعر میں:-

یاں پلتھن نکل گیا واں غیر　　　　اپنی تکّی لگائے جاتا ہے

میں دلّی اور اس کے تہذیب و تمدن کا بھرپور مرثیہ سنائی دیتا ہے۔ اگر یہ میرؔ کے ساتھ بے انصافی اور تمسخر نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

اسے میرؔ کی بدقسمتی کہا جائے یا نئی ادبی نسل کی بدنصیبی کہ اس نے سماجی شعور اور ہمہ گیر فکر سے بچنے کے لئے کلیاتِ میرؔ کی پناہ لی، اور اپنی ذات کے محدود گھروندے میں آبیٹھی۔ نئی نسل کے شاعروں میں سے بہت کم ایسے ہیں۔ جنہوں نے ترقی پسند تحریک کی عینک اتار کر اپنی آنکھوں سے زندگی کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ معدودے چند ایسے ہیں جنہوں نے سماجی شعور کو سیاسی پروپیگنڈے سے الگ کیا۔ اور اس کی حد بندی کو سمجھا۔ سماجی شعور کی جو تعریف ترقی پسندوں نے کی تھی وہ یقیناً غلط تھی لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ہمارے دور کی شاعری کو سماجی شعور کی ضرورت نہیں ہے یا وہ اپنے دور کے مسائل پر غور و فکر کرنے کی زحمت سے بے نیاز ہے؟

کیا شاعر کا صرف اتنا ہی کام ہے کہ اپنے نجی جذبات و محسوسات کی کتھا نہایت افسردہ لے میں سناتا رہے۔ وہ ہم سے اپنے مکان کی کیفیت، اپنے گذشتہ محبت کے افسانے، اپنی موجودہ محبوبہ کی سرانگشتِ حنائی کی تعریف کرتا رہے۔ یا کبھی کبھی ماتمیہ لے کے ساتھ ہماری ہمدردیاں حاصل کر لے۔ کیا شاعر کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے دور کے الجھے ہوئے مسائل کو سمجھے اور اپنے

جذبات وخیالات کو صرف بھی دریافت نہ بنائے۔ بلکہ اس میں عصرِ حاضر کے دل کی دھڑکنوں کو سمو لے اس کی آواز ایک عہد کے "درد وداغ وجستجو وآرزو" کی آواز بن جائے۔ ضروری نہیں ہے کہ یہ آواز سیاسی آواز ہو یا اس میں کسی ہنگامی واقعے کا تذکرہ اور اس پرخطیبانہ انداز کا پیش لفظ شامل ہو۔ لیکن اگر شاعر اور مفکر کو الگ الگ دو خانوں میں بانٹ دیا گیا تو کافی مدت کے لئے عظیم شاعری کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ ہر مفکر کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ فلسفی بھی ہو لیکن اس کی فکر میں ربطِ باہمی اور ایک وحدت ضرور رہتی ہے اور یہ ربطِ باہمی اور وحدت ہی وہ شے ہے جو شاعر کی نجی شخصیت اور اس کے دور کو یک جا کرتی ہے اور اس کی آواز کو اس کے دور کی آواز بنا دیتی ہے۔

(۲)

ترقی پسند تحریک پر دوسرا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اس نے مواد کو ہئیت پر اور نفسِ مضمون کو اسلوب پر غیر ضروری حد تک ترجیح دی۔ کیا بات کہی گئی ہے اور وہ بات کس حد تک پارٹی لائن کے مطابق ہے اس بات پر اتنا زور دیا گیا کہ یہ بالکل بھلا دیا گیا، کہ یہ بات کس طرح کس انداز اور سلیقے سے کہی گئی ہے۔ اندازِ بیان اس حد تک غیر اہم سمجھا جانے لگا تھا کہ غیر موزوں اشعار اور بے ہنگم مصرعوں کے باوجود ہنگامی نظموں کو ادبی شاہکار قرار دے دیا گیا۔ تیسرے درجے کے گھٹیا اور صحافتی شاعر بڑے اہم قرار دیئے گئے۔

اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ اسلوبِ بیان کو نفسِ مضمون پر غیر ضروری حد تک ترجیح دی جانے لگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلوبِ بیان بہت اہم ہے لیکن اسلوبِ بیان کی وہ تعریف بڑی ہی ناقص ہوگی جس میں نفسِ مضمون کے انتخاب اور اس کی تنظیم وترتیب پر زور نہ دیا جائے۔ دراصل اسلوبِ بیان کا سوال تو اس لمحے ہی سے شروع ہو جاتا ہے جب شاعر موضوع کا انتخاب کرتا ہے اور اس کے متعلق ایک مخصوص زاویئے سے لکھنا چاہتا ہے۔ ایسی حالت میں نفسِ مضمون کو اسلوبِ بیان سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

غیر موزوں اشعار اور بے ہنگم مصرعوں کو نظر انداز کرنے کا ردِ عمل یہ ہوا کہ نئی نسل نے روایت کی اہمیت کو اس قدر شدت سے محسوس کیا کہ اس کی اپنی انفرادیت خطرے میں پڑ گئی۔ روایت کی تقلید پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔ ہاں روایت کا تخلیقی احساس ترقی کا ضامن ہوتا ہے۔ نئی نسل کو یہ احساس تھا کہ ترقی پسندوں نے روایت کا خاطر خواہ احترام نہیں کیا۔ غزل کو بُرا بھلا کہا، اساتذہ کا چرچا نہیں ہوا کلاسیکی سرمائے کو بار بار نہیں کھنگالا گیا۔ اس لئے ردِ عمل کے طور پر نئی نسل نے قدیم اساتذہ کی پیروی کو عزیز رکھا۔ وہی انداز، وہی مضامین اور وہی لب ولہجہ نقل کرنے کی کوشش کی گئی یہی نہیں متروک تراکیب، محاورے اور الفاظ بڑے شوق سے استعمال کئے جانے لگے، پرانی زمینوں میں پرانے ردیف اور قافیے کے التزام کے ساتھ غزلیں لکھی جانے لگیں۔ بدپیرہن کی شاخ، سمن کی شاخ" ارغوان، گلاب کے پھول، تتلیاں ———— اس عہد کی غزلوں کی زمینیں ہیں۔ پہلے زمانے میں بھی یہ زمینیں فکر اور جذبے کی کمی کو پورا کرنے کے سلسلے میں عام ہوئی تھیں اور اصل شاعری کی نہایت ناکافی معذرت کی حیثیت رکھتی تھیں۔ آج بھی ان کی یہی حیثیت ہے۔

فن کو بہت سے شعراء نے در و بام کی آرائش سمجھ رکھا ہے جس طرح ترقی پسند شعرا خطابت کی خشک نثریت کو چھپانے کے لئے تشبیہوں اور استعاروں کی کثرت اور تکرار سے کام لیا کرتے تھے۔ آج کے شعراء روایت کے نقلی ملمع سے وہی کام لے رہے ہیں "تبئی دو پیارے" "یارو" جاوے ہے، آوے ہے" وغیرہ استعمال کرنے سے نہ روایت کا حسن حاصل کیا جا سکتا ہے نہ میرؔ کا بھرم رکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح "نذرِ سودا" "نذرِ میر" اور "نذرِ مصحفی" کے عنوانوں سے اساتذہ کی زمین میں غزلیں لکھ کر ادب کی کوئی خدمت نہیں کی جا رہی ہے

سوال یہ نہیں ہے کہ کون زیادہ کامیابی سے اساتذہ کے پینترے اور ان کے انداز کی نقل اتار سکتا ہے۔ کیونکہ ان کا انداز صرف پینترے بازی نہیں تھا۔ ان کا کارنامہ ان کی زمینوں ـــــ یا متروک الفاظ میں نہیں ہے۔ بلکہ اس ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی میں ہے جو انہوں نے اپنے دور کی زندگی سے حاصل کی تھی۔ فکر اور جذبے کے اس حسین مجموعے میں ہے۔ جسے وہ الفاظ کے تمام دروبست اور شاعری کی پوری نزاکتوں کے ساتھ پیش کر سکتے تھے۔ ان کا اندازِ بیان اس لئے دل کش ہے کہ وہ ان کے نفسِ مضمون سے ہم آہنگ ہے وہ فی نفسہٖ سب کچھ نہیں ہے۔

یہ بات ہر قدم پر یاد رکھنے کی ہے کہ ہر دور اپنی روایات خود تراشتا ہے اور ہر روایت میں صالح عناصر کے ساتھ ساتھ خطرناک عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ میرؔ کی تعریف، ان کی استادی اور عظمت کے اعتراف سے کسے انکار ہوگا۔ لیکن میرؔ کے کلام میں اپنے خیالات کے مطابق معنی ڈھونڈھ نکالنا اور انہیں میرؔ کے سر منڈھ دینا بھی اسی قدر غلط ہے جتنا میرؔ کے کلام میں یاس، افسردگی اور داخلیت کے حد سے زیادہ بڑھے اثر کا اعتراف نہ کرنا۔ میرؔ میں "تابِ مقاومت" کی تلاش کرنے کی بجائے ہمیں میرؔ کے کمزور پہلوؤں کو بھی تلاش کرنا چاہیئے اور ان سے دامن بچانے کی کوشش کرنا چاہیئے، ان کی داخلیت، ان کی افسردگی، ان محدود دائروں سے اثر قبول کرنے کے بجائے ہمیں ان کی انسان دوستی، ان کے لہجے کی نرمی، ان کی آواز کا گداز اور ان کی شخصیت اور ان کے دور کی ہم آہنگی سے متاثر ہونا چاہیئے۔

یہ صحیح ہے ترقی پسندی نے روایت کے بارے میں مناسب رویہ نہیں اپنایا۔ ترقی پسند کلاسیکی ادبیات سے بے نیاز ہو گئے ان میں سے بہت کم نے اساتذہ کے دیوان سے کچھ سیکھنے کی کوشش کی لیکن اس کا انتقام یہ تو نہ ہوگا، کہ ہمارا نیا شاعر اپنے گرد و پیش کی ہلکی سی جھلکیوں پر قناعت کر کے اساتذہ کے دیوان میں جا گھسے اور روایت کا نقاب اوڑھ لے۔

ہمیشہ روایت کی مدد سے ادبی تاریخ میں نئی روایت قائم کی گئی ہے۔ سب سے بڑی روایت یہ ہے کہ روایت کی اندھی تقلید کا طلسم توڑا جائے۔ سب سے بڑی روایت یہ ہے۔ کہ روایت کو پاؤں کی زنجیر نہ بننے دیا جائے، بانگِ درا بنایا جائے۔

روایت کی تقلید کے ساتھ ہماری ادبیات میں ایک نیا رجحان یہ پیدا ہوا ہے کہ ماضی کی ساری باتوں کو عقیدت اور پیار کے ساتھ اپنایا جائے۔ یورپ میں ترقی پسندی کا زوال ہوا تو بہت سے دانش ور مذہبی احیاء کی طرف راغب ہو گئے کچھ کیتھولک ہو گئے کچھ کرسچین ڈیموکریسی کے سرگرم حامی بن گئے۔ کچھ قبائلی مذاہب تک پر ایمان لے آئے۔ مذہب کی حمایت بڑے شد و مد سے کی جانے لگی "پاکستان میں اس رجحان نے" پاکستانی ادب" کا نام اختیار کیا اسی کا ایک نتیجہ اسلامی ادب کی بحث کی شکل میں ظاہر ہوا تھا۔ یہ بزرگ انسان کے "روحانی مسائل" سے بہت پریشان تھے۔ دوسرے ہر دقیانوسی چیز کو کارنامہ قرار دینے کا رجحان بڑھا۔ یہ اچھی بات ہے کہ مغربی ادب کا اثر ختم ہوا تو ہمارے ادیب اپنے ملک اس کے رسم و رواج، اس کی سرزمین سے قریب آئے اپنے میلوں ٹھیلوں کی عکاسی ہونے لگی، اپنے قصبوں کی زندگی سے لگاؤ پیدا ہوا، لیکن کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم پرانے عہد کی ساری قدروں کی مدح سرائی کرنے لگیں؟ کیا اس عہد کی رومانی صورت۔ جاگیر دارانہ اونچ نیچ کا تصور، عصمت اور پردے کے لایعنی تصورات اور ان تمام بندشوں کو مدحیہ انداز سے پیش کرنے کا کوئی جواز ہے؟ کیا اب قدیم توہمات گھٹن، غیر ضروری، مذہبی اور سماجی بندشوں کے خلاف لڑنے کی ضرورت باقی نہیں ہے؟ ایک نوجوان مرد اور عورت ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور صرف سماجی بندشوں کی بنا پر وہ ایک دوسرے سے اپنی محبت کا اظہار

بھی نہیں کر پاتے اور خاموش افسردگی کے ساتھ چلتے رہتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے الگ ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ پاس اور لحاظ، یہ افسردگی اور یہ بند شیں اس قابل ہیں کہ انہیں اعلیٰ قدر کے روپ میں پیش کیا جائے ؟ کیا ہم سب کا فرض نہیں ہے کہ روایت کے اس مکروہ حصے کو اپنے سماج سے کاٹ کر پھینک دینے کی کوشش کریں ؟

(۳)

ترقی پسند تحریک سے عام بیزاری کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ترقی پسندوں نے جمالیاتی پہلو پر زور نہیں دیا وہ بیانات کی صداقت اور افادیت پر ہی اصرار کرتے رہے۔ انہوں نے فن کے تخلیقی عمل کی ساری نزاکتوں کو نہیں سمجھا۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری میں خاص طور پر ادبیات اور فنونِ لطیفہ میں عام طور پر الفاظ محض بیان کا ذریعہ ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتے ہیں۔ وہ صرف الجبراکی علامتیں نہیں ہیں۔ جو مختلف تصورات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہاں الفاظ کی اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ وہ رنگ و آہنگ کی دنیا کی کلید ہوتے ہیں۔ وہ ذریعہ ضرور ہیں۔ لیکن اس کے ماوراء وہ ایک ایسی فضا قائم کرنے کا کام بھی کرتے ہیں۔ جو صرف معنی کی ترسیل تک محدود نہیں ہوتی بلکہ جمالیاتی لذت بھی بخشتی ہے۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ معنی کی ترسیل اور جمالیاتی لذت کی ترسیل کے دونوں کام ایک ہی الفاظ انجام دیتے ہیں۔ اس لئے وہ بیک وقت مفہوم اور لذت دونوں بخشتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ مفہوم ظاہر کرنے کے لئے ایک طرح کے الفاظ استعمال کئے جائیں، اور پھر جمالیاتی انبساط پیدا کرنے کے لئے دوسرے الفاظ اور تراکیب لاکر انہیں سجایا جائے۔

نئی نسل چونکہ نفسِ مضمون اور بیان کی ذمہ داری کی خواہاں ہے اور جمالیاتی پہلو کی کس مپرسی کے ردِ عمل کے طور پر جمالیات کا بار بار تذکرہ کرتی ہے۔ اس لئے اس نے جمالیات ہی کے سہارے ایک غیر حقیقی دنیا قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ دنیا کچھ اس قسم کی ہے جیسے حجاب امتیاز علی کے افسانوں کی تھی۔ یہاں ڈاکٹر گار۔ ردجی۔ جسوتی اور بوڑھی زوناش شاید نہ ملیں۔ لیکن افسردہ دلی کا مستقل ماتم، خود کلامی، اپنے آپ سے شکوے، محبوب کے آجانے پر بھی تسکین نہ پانے کی شکایت، رسوائی کا چرچا، دیوانگی میں بیاباں بیاباں گھومنے کے تذکرے ملیں گے۔ اگر آج کی شاعری کا ایک عام تجـزیہ کیا جائے۔ تو اس میں زیادہ تر انہیں مضامین کی تکرار نظر آئے گی۔

افسردگی کا ذکر یا شکست کا احساس ادب میں گناہ نہیں ہے۔ لیکن اسے فیشن کے طور پر اپنے اوپر مسلط کرنا اور ماتمی لے کو اوڑھنا بچھونا بنا لینا کسی سنجیدہ فکر یا ذمہ دار ادبی ذہن کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ پڑھنے والا پہلے خود کو اس فضا کا عادی بنائے پھر شاعر کے دکھ درد پہ ہمدردانہ جذبات پیدا کرے۔ ورنہ یہ بناوٹی مجنوں کی نقل، یہ رسوائی اور دیوانگی سے کوئی علاقہ نہ ہوتے ہوئے رسوائی اور دیوانگی کا بہروپ بھرنا صرف دوسروں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے افسردگی کا لبادہ پہن لینا یہ سب باتیں جمالیات سے کوئی علاقہ نہیں رکھتیں۔

(۴)

ترقی پسند تحریک پر غالباً سب سے بڑا اعتراض یہی کیا گیا ہے کہ اس نے ادب کو سیاسی پروپیگنڈا بنا دیا اور اس کا تعلق عام انسانی قدروں سے قائم نہیں رہا۔ یہ اعتراض یقیناً صحیح ہے۔ لینن نے ادب کو "طبقہ وارانہ" کہا تھا اور اسے طبقاتی جنگ کا آلۂ کار قرار دیا تھا۔ ترقی پسند تحریک نے اس مقولے کو پوری میکانکی سادگی کے ساتھ برتنے کی کوشش کی۔

لیکن کیا اس غلط میلان کا ردِعمل یہ ہونا چاہیئے کہ ہمارے شاعر اور ادیب نہ صرف سیاست کو بلکہ تہذیب کو اور عمرانی زندگی کے تمام تر مسائل کو غیر ادبی قرار دے کر ان سے ادب کو چھٹکارا دلانے کی جد و جہد کریں۔ ترقی پسندی نے ادب کا رشتہ محض ادبیات ہی تک محدود نہیں رکھا تھا اور اسے اس حد تک بکھیر دیا تھا کہ زندگی کے سارے علوم و فنون اور خاص طور پر سیاست اس پر حاوی ہوگئی تھی۔ اور غیر ادبی انداز سے حاوی ہوگئی تھی۔ نئی نسل نے اس کے ردِعمل کے طور پر ادب اور شعر کا رشتہ دوسرے علوم سے توڑنے کی کوشش کی ہے اور اسے خالص ادبی دائروں تک محدود رکھنا چاہا ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ ادب اور دوسرے علوم کا رشتہ قائم رکھا جاتا اور اسے زیادہ ادبی انداز سے قائم رکھا جاتا۔

اس میں شک نہیں کہ مصوری اور موسیقی کی چند اصطلاحیں نئی شاعری میں مستعمل ہوئی ہیں۔ کچھ تصویریں اور تصورات جدید مصوری سے مانگ لئے گئے ہیں لیکن ہمارے دور کے اہم مسائل پر نئی شاعری نے حیرت انگیز خاموشی اختیار کی ہے۔ سیاست شجرِ ممنوعہ نہیں ہے۔ ادب نے سیاست کو بھی موضوع بنایا ہے لیکن سیاست زدگی ضرور گناہ ہے۔ سیاست کے نقطۂ نظر کو ادبی انداز پر ترجیح دینا گناہ ہے۔ لیکن اس سے بڑا گناہ یہ ہے کہ شاعری اور ادب کو دلچسپی کا بھی مشغلہ بنایا جائے۔ اور ادب کو عہدِ حاضر کی اہم حقیقتوں کا آئینہ دار نہ سمجھا جائے۔

شاعر اور ادیب بنیادی طور پر دانش ور ہوتا ہے اور دانش صرف اندازِ بیان کے پینتروں سے جان لینے اور ادب کے حدود اربعہ کی پیمائش کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اپنے دور کی بصیرت کو اپنانے اور استعمال کر لینے کا نام ہے۔ اس لئے شاعر اور ادیب کو کسی نہ کسی حد تک مفکر ضرور ہونا پڑے گا۔ خواہ وہ فلسفی نہ ہو۔ نیز اس کی فکر صرف ادبی دائرے میں گھر کر پنپ نہ سکے گی۔ اسے دوسرے علوم اور زندگی کے دوسرے شعبوں تک رسائی بھی ضرور حاصل کرنا ہوگی۔

اس لئے خالص ادبی دائرے کا تصور اور تخصیص بنیادی طور پر غلط ہے۔ ادبی اندازِ نظر مخصوص ایک ضروری چیز ہے۔ سیاست داں ہر مسئلے کو اس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے کہ اس کے نظریہ اور اس کی پارٹی کو اس خالص بات سے کتنی تقویت حاصل ہوئی۔ کتنے لوگ اور اس کے ساتھ آتے پارٹی کی مقبولیت کتنی اور بڑھی لیکن ادیب کا نقطۂ نظر عام انسانی نقطۂ نظر ہوتا ہے وہ اس واقعے میں انسانی کردار کا روپ پہچاننے اور انسانی زندگی کی صداقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن زندگی دونوں کا میدان ہے اور اس سے قطع تعلق کر کے کوئی سچا ادیب زیادہ دن اس لقب کا مستحق نہیں رہ سکتا۔

جہاں ادب کو صرف اس اعتبار سے پرکھنا غلط ہے کہ وہ سماج پر کونسا فوری اثر ڈالتا ہے۔ وہاں اسے صرف نجی ذریعۂ اظہار قرار دینا بھی غلط ہے۔ ادب ہماری انفرادیت کا روپ رنگ بھی ہے اور ہماری تہذیب کا ذریعہ اظہار بھی۔ ترقی پسند تحریک کی کمزوریوں سے ہوشیار رہنا اور اس کی سخت تنقید کرنا یقیناً صحت مند ادب کے لئے ضروری تھا لیکن اس کے ردِعمل کے طور پر ذات کے مریضانہ بھنور میں گھر کر رہ جانا یا نیم وحشی خول میں مقید ہونا اس سے بھی بڑی غلطی ہوگی۔ ترقی پسند تحریک پر نکتہ چینی کرتے وقت یہ بات برابر یاد رکھنی چاہیئے کہ اس تحریک نے ایک تاریخی خدمت سر انجام دی ہے اور شعر و ادب کو منو برکے غیر حقیقی سایوں اور کچلی ہوئی شخصیت کی مریضانہ داخلیت سے نکال کر استے کھلی شاہراہوں اور وسیع فضاؤں کا باسی بنایا ہے۔ اسے سماجی شعور بخشا ہے۔ اور علم و دانش سے اس کے رشتے استوار کئے ہیں۔ افراط و تفریط میں یہ تحریک سطحیت اور بے ادبی ابتذال کی طرف چلی گئی۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ترقی پسندی سے دور رہنے کی کوشش میں نئی نسل دوبارہ منو برکے غیر حقیقی سائے اور مریضانہ داخلیت کے کابوس کی طرف چلی جائے۔

ترقی پسندی بھی دوسری روایات کی طرح ادب کی ایک روایت ہے اور دوسری تمام روایتوں کی طرح اس کی خوبیاں بھی ہیں اور کمزوریاں بھی ہیں اس کی خوبیوں کو اپنانا اور کمزوریوں پر سختی سے نگاہ رکھنا ادبی ترقی کے لئے ضروری ہے لیکن اگر وسعت اور سماجی شعور کے نام سے گھبرا کر نئی نسل اعصابی شاعری کی طرف رجوع ہوگئی یا روایت کا نام لے کر سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی یا اساتذہ کے پینترے بازی میں الجھ کر رہ گئی تو یہ بڑی بدقسمتی ہوگی۔ مریضانہ داخلیت اور روایت پرستی کے اس زبردست خطرے سے آگاہ رہنا اور اس کا مقابلہ کرنا آج ایک ادبی ضرورت بن گیا ہے۔ آج پھر ادب میں نئے اعتدال اور توازن کی ضرورت ہے۔ اور اسی اعتدال اور توازن ہی کی بنیاد پر صحت مند ادب کی تخلیق کا کام کیا جاسکتا ہے۔

دیدہ و دِل

احمد ندیم قاسمی

(ایک تاثر — ۱)

گذشتہ پندرہ بیس برس میں ترقی پسند ادب کی تحریک ایک واضح تخلیقی نصب العین کی موجودگی کے باوصف زیادہ تر تجربات کے دور میں سے گذری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ایسے لمحے بھی آئے ہیں۔ جب کوئی نئی بات یا پُرانی بات کو نئے انداز سے کہنے والے ہر شاعر اور ادیب کو ترقی پسند ادب کی تحریک نے اپنا لیا۔ اور نقادوں پر یہ راز برسوں بعد جا کر کھُلا۔ کہ کوئی نئی بات کہنا یا کوئی بات کہنے کے لیے نیا انداز اختیار کرنا ہی ترقی پسندی نہیں۔ بلکہ دیکھنا یہ چاہیئے۔ کہ جو بات کہی گئی ہے۔ وہ کہنے کے لائق بھی ہے یا نہیں؟ اس سے زندگی کی کون سی حقیقت نمایاں ہوئی ہے اور کیا اس حقیقت کے عرفان سے ذہن میں زندگی کی عظمت، حسن اور توانائی کا احساس پیدا ہوتا ہے یا تھکن، جھُنجھلاہٹ اور گھُٹا گھُٹا تڑپ اُداسی کا۔ اور پھر بات جس انداز میں کہی گئی ہے۔ اس سے کیا فن کے وہ تقاضے پُورے ہوتے ہیں؛ جن کی وجہ سے شاعر یا ادیب یا مصوّر کو حسن کار کہا جاتا ہے۔ اور کہیں یوں تو نہیں۔ کہ کہنے والے کو کسی نہ کسی طرح بات کہہ دینے سے کام رہا ہے یا وہ کچھ کہنے کی بجائے محض ہیئتی کرتب ہی دکھاتا رہا ہے۔

تجربہ ندرت کی جان ہے۔ اور صرف فن ہی میں نہیں۔ زندگی کے کسی بھی تخلیقی شعبے میں اگر تجربے کا تسلسل کٹ جائے۔ تو اسے بہت بڑا المیہ کہنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ان تجربوں نے (ترقی پسند ادب کی تحریک کی حد تک) بعض افراد کے معاملے میں نظریاتی اور نصب العینی الجھنیں پیدا کی ہیں۔ وہاں انہی تجربوں نے بعض حالات میں شعر و فن کو تازگی بھی بخشی ہے۔ کسی عالمگیر ادبی تحریک میں بیس برس کی مدت کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اس لیے گذشتہ برسوں کی الجھنوں، افراتفریوں اور تذبذبوں پر کُڑھنا اور جھُنجھلانا بے جا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے۔ کہ ہماری تحریک نے ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۵۵ء تک اُردو ادب میں کتنی نمایاں اور صحت مند تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ اور آج اُردو شاعری اور افسانہ نگاری کے تیور کتنے بدلے ہوئے ہیں۔ ادب میں زندگی کی یہ ہمہ گیری اور ہمہ جہتی اسی تحریک کی دین ہے۔ اور اگر پاکستان کے ادب کو اس جمود و خمود اور اضمحلال و پژمردگی سے بچانا ہے۔ جو فن کی بعض جدید مغربی تحریکوں کا ناگزیر نتیجہ ہے اور جس سے ہمارے بیشتر نوجوان شاعروں اور مصوروں کا ایک طبقہ اپنے فنی خلوص کے بھولپن کے باعث متاثر ہو چلا ہے۔ تو اسے ترقی پسند ادب کی تحریک ہی کو اپنانا ہوگا جس نے انسان دوستی کی روایات کو آگے بڑھایا ہے۔ قنوطیت اور مقدر پرستی کے سحر توڑے ہیں۔ جنسی انتشار پسندی، رہبانیت اور حیوانیت کی قلعی کھولی ہے۔ اور اُردو ادب کو زیادہ حسین اور زیادہ پُرمایہ بنایا ہے۔

عارف عبدالمتین کے مجموعۂ کلام "دیدہ و دل" کے بارے میں اپنا تاثر بیان کرنے سے پہلے ترقی پسند ادب کی تحریک سے متعلق

یہ مختصر سا اظہارِ خیال اس لیے ضروری تھا۔ کہ عارف ان ترقی پسند شاعروں میں سے ایک ہے۔ جنہوں نے اس تحریک کے ساتھ وابستگی میں بڑی مستقل مزاجی اور استقامت کا ثبوت دیا ہے۔ عارف نے جب سے شعر کہنا شروع کیا ہے۔ (اور یہ شاید آج سے پندرہ برس پہلے کی بات ہے) اس نے ترقی پسند ادب کی تحریک کے تخلیقی نصب العین کو اپنی تمام فنی سرگرمیوں کا محور قرار دے رکھا ہے۔ اسی لیے اس کے کلام میں وہ سب کچھ ہے۔ جو گذشتہ پندرہ برس میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے نمایاں عناصر رہ چکے ہیں۔ موضوعی اور ہیئتی تجربے ہیں۔ جن میں بعض کامیاب ہیں۔ اور بعض کی کامیابی مشکوک ہے۔ بات کہنے کے نئے تیور ہیں مگر لہجے میں وہ ٹھہراؤ ابھی پوری طرح پیدا نہیں ہو سکا۔ جو ایک شاعر کو دوسرے شاعر سے الگ پہچاننے میں مدد دیتا ہے۔ اور جسے شاعر کا اسلوب یا انفرادیت کہتے ہیں۔ البتہ عارف نے اپنی فنی انفرادیت کا ایک خاکہ ضرور معین کر لیا ہے۔ جس میں وہ آئندہ رنگ بھرے گا۔ اور اس کام کے لیے اس کے پاس ذہانت بھی ہے، تخلیقی لگن بھی ہے اور وہ قوت اور حوصلہ بھی جو فنی ریاضت کا دوسرا نام ہے۔

عارف کی ابتدائی نظموں میں اگرچہ الفاظ، ترکیبیں اور سانچے پختہ نہیں ہیں۔ مگر قابلِ غور بات یہ ہے کہ ابتدائی دور میں بھی اس نے کوئی بڑی اور گہری بات کہنے اور اس کی تمام اہم جزیات کا احاطہ کر لینے کی کوشش کی ہے۔ یہ خصوصیت بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی ہے۔ کہ اپنے ابتدائی دور ہی میں سستی جذباتیت سے بچ کر حقیقتوں کی جستجو میں لگ جائیں۔ عارف کی ان نظموں میں کہیں کہیں سماج کو بھی بُرا بھلا کہا گیا ہے۔ اور "عوارض ذبح دجج خیابان خیابان"۔ اور "آنسو اپنا، لہو اپنا یا پسینہ اپنا" اور "وہ لوگ بھی نظر آئے بجھے بجھائے ہوئے"۔ ایسے مصرعے بھی موزوں کیے گئے ہیں۔ پھر "کشمکش"۔ ایسی نظموں میں غالب اور بعد کے چند شعراء کی طرح (جن میں ن، م، راشد سر فہرست ہیں) ناکردہ گناہی کی حسرت کی داد بھی طلب کی گئی ہے مگر اس قسم کی کمزوریاں کہاں نہیں ہوتیں۔ عارف نے بہت اچھا کیا۔ کہ ان نظموں کو بھی مجموعے میں شامل کر دیا۔ کیونکہ شاعر کا ابتدائی کلام اس کے فن کے تدریجی مطالعہ میں بہت ممد ثابت ہوتا ہے۔ مگر اس سے قطع نظر اس ابتدائی دور میں "دھواں" ایسی نظمیں بھی موجود ہیں جن میں عارف نے جنسِ لطیف کے قرب اور عنفوانِ شباب کی وابستگی کا ایک نفسیاتی لمحہ نظم میں متشکل کر دیا ہے۔ پھر "لہروں کی آغوش میں" ایسی نظمیں ہیں۔ جن میں تشبیہوں اور استعاروں کے سہارے نہایت لطیف کنائے برتے گئے ہیں (مثلاً کاش اس وقت، یہ اڑتا ہوا رنگین پرند —— سرمدیت کے شوالے کا گجر بن جائے!) البتہ اس ابتدائی دور میں عارف اپنے فنی مقصد کو واضح طور سے متعین نہیں کر سکا۔ کہیں "دھواں" میں اس پر اسرار اور کیف آور سپردگی کو شعر میں منتقل کر دیتا ہے۔ جسے میں بڑی شاعری میں شمار کرتا ہوں۔ اور کہیں وہ اس سپردگی کے سحر سے چونک کر رقص گاہ سے بھاگ نکلتا ہے میاں کی "حکمت فشانی، خونریزی، آسودگی اور خوابناکی" اسے یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ کہ وہ زندگی سے دور ہوا جا رہا ہے فنکار کو زندگی سے دوری کو یقیناً کسی صورت میں قبول نہیں کرنا چاہیئے۔ مگر اس طرح انفرادی اور اجتماعی احساسات کے درمیان حدِ فاصل بلند کر دینا ضروری نہیں ہے۔ اچھے شاعروں کے ہاں یہ خطِ امتیاز موجود نہیں ہونا چاہیئے۔ اور عارف نے بھی آگے چل کر اس خط کو مٹا دیا ہے۔ ایک یہی ثبوت اس امر کے لیئے کافی ہے کہ عارف کا فن بتدریج ترقی پذیر ہے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ عارف کی شاعری میں بہت نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اس تاریخ کے بعد عارف نے اپنے

بیشتر محبوب موضوعات فن پر سے غیر ضروری جذبات کی شبنمیں جھاڑ دی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہُوا ہے کہ بعض دُوسرے موضوعات کے معاملے میں اس نے شدت پسندی اختیار کر لی ہے۔ یہ درست ہے۔ کہ بعض موضوعات کی نوعیت ہی شدت کی متقاضی ہوتی ہے۔ مثلاً جب عارف یہ کہتا ہے ؎

جو زندگی سے فرار ڈھونڈھیں، جو موت کی وادیوں میں بھٹکیں
میں آج بھی ان سے مختلف ہوں، میں کل بھی ان سے جُدا رہا ہُوں

تو اسے اپنے نظریے اور اپنے خلوص کے اظہار کے لیے یقیناً ایسا ہی لہجہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ مگر بعض موضوعات ایسے بھی تو ہوتے ہیں۔ جن کے ساتھ، ضبط و اعتدال کے بغیر انصاف ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مذہب کو میں ایسے ہی موضوعات میں شمار کرتا ہُوں۔ اور اسی لیے جب عارف اسی عنوان کی ایک نظم میں کہتا ہے کہ مذہب انسان کے لیے صرف "بازیچۂ فردوسِ ایجاد" کتا رہ جاتا ہے۔ تو میں اس سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میری رائے میں مذہب اپنے ماورائی عناصر سے قطعِ نظر انسانیت کو اخلاق، نیکی اور انسانی ہمدردی کا درس بھی تو دیتا رہا ہے۔ مذہب بنیادی طور سے نہ "مجہول قناعت" کا سبق دیتا ہے اور نہ "خیروں کو رو باہی" سکھاتا ہے۔ مذہب کی روایتی صُورت کو اصل مذہب کہنا غلط ہے۔ کسی بھی نظریے یا ادارے کی روایتی اور مروجہ صورت سے فن کار کا اس کی حقیقی ماہیئت کے بارے میں دھوکا کھا جانا غلط ہے۔ اور اسی لیے مجھے ذاتی طور سے اس قسم کی شدت سے ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔

اسی قسم کی شدت پسندی بعض اوقات ایسے مقامات پر طنز کی چوٹ لگا جاتی ہے۔ جو چوٹ کے مستحق نہیں ہوتے عارف کا شعر ہے ؎

صدائے دل سے عبارت ہیں جن کے شعر، وُہ لوگ
صریرِ خامہ کو لکھتے نہیں نوائے سروش!

یہ شعر پڑھ کر معاً غالب کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے!

اور اگرچہ عارف اپنے شعر میں دراصل اس نظریۂ فن پر چوٹ کر رہا ہے۔ جس کی رُو سے فن غیر ارضی اور خالص سماوی چیز بن جاتا ہے۔ لیکن عارف کا انداز کچھ ایسا ہے۔ کہ اس کی زد میں غالب اور اس سے پہلے اور اس کے بعد کے وُہ تمام شعرا آجاتے ہیں۔ جو اپنے تخلیقی اہتزاز اور فنی لگن کو "نوائے سروش" کہہ کر خوش ہو لیتے تھے۔ لیکن جن کا مقصد محض یہ تھا۔ کہ وُہ عام انداز سے ہٹ کر فکرِ سخن کرتے ہیں۔ اور ان کا فن "آورد" سے ملوث نہیں ہے۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ ؎

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو!
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مگر عارف کے ان موضوعات کی تعداد بہت کم اور محدود ہے۔ جن کے سلسلے میں اُس نے شدت پسندی اختیار کی ہے۔ اگر عارف کے فن کا عمومی رنگ ہی یہی ہوتا۔ تو شاید مجھے اس اعتراض کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ مگر جب عارف یُوں بھی کہہ سکتا

سنبے کہ ؎ سکوتِ لالہ و گل میں بھی نغمگی سی ہے!

تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس قسم کی بچی تُلی متوازن فنی کیفیت کا اظہار عارف کے بس میں ہے۔ اور خاص طور سے اپنی غزلوں میں تو اُس نے اس کلاسیکی خود ضبطی کا نہایت دلآویز مظاہرہ کیا ہے۔

عارف کا نظریۂ فن خود اس کے اپنے الفاظ میں یہ ہے کہ ؎

ریگِ رواں کو پانی کہنا کچھ دل لگتی بات نہیں

اس حقیقت پسندی میں پہلے اس عالمگیریت کو شامل کریجئے ؎

تیرا میرا پیار ہے دُنیا بھر کے پیار سے ہم آہنگ
پُورب پچھم اُتر دکھن ایک کہانی ایک انسان!

اور پھر اس میں اسی احساسِ لطیف کا اضافہ کریجئے جس میں بڑی منطق اور سمجھ میں آنے والی افسردگی بسی ہوئی ہے ؎

غمِ جیب لُٹا کر غمِ جہاں پایا!
مَیں، آج خوش ہی نہیں ہُوں، بہت اُداس بھی ہوں

یہ تین عناصر عارف کی شاعری کا نچوڑ ہیں۔ اور انہی بنیادوں پر اس نے اپنے فن پاروں کی تعمیریں اُٹھائی ہیں۔ یہ آخری احساسِ لطیف اس کی غزل گوئی کا محور ہے۔ لیکن جہاں عارف نے اس احساس کو نظم میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے۔ وُہ اپنی تمام اعتدالِ طبع اور اپنے جاندار نظریۂ فن کے باوجود قنوطی سا ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر اس کی ایک نظم "کرب" پیش کی جا سکتی ہے۔ جس میں وُہ اپنے آپ کو ایک ایسا پیڑ محسوس کرتا ہے۔ جو ڈال پات سے محرُوم ہے۔ ایک ایسا انسان جس کے مقدر کی راتوں میں نہ کوئی تارہ ٹوٹتا ہے۔ اور نہ کوئی جگنو چمکتا ہے۔ یہاں تک، کہ تاثر کو ہم قنوطیت پر محمول نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ہمارے ہاں کے معاشرے میں بیشتر افراد کی مثال یہی پیڑ ہے۔ مگر عارف اس سے آگے بڑھتا ہے۔ نظم میں اس قسم کے خوبصورت ٹکڑے سجا کر ؎

دل سلگتا ہے کسی پنبۂ تر کی صُورت!
جس کی قسمت میں بھڑکنا ہے نہ بجھ جانا ہے

اور ؎

لیکن اک ہم ہیں کہ دریا کے کنارے کی طرح
بحرِ اندوہ میں کٹ کٹ کے گرے جاتے ہیں

شاعر اس نفسیاتی ماحول سے خودکشی کی ترغیب حاصل کرتا ہے۔ اور عارف ایسے رجائی شاعر کو قنوطیت کی اس حد تک جاتا دیکھ کر ذاتی طور سے مجھے بے حد مسرت ہوتی ہے۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے۔ کہ افسردگی اور قنوطیت میں بہت بڑا فرق ہے پھر اس کی ایک نظم "برزخ" ہے۔ جو ایک مستقل استفہامیہ ہے۔ ایک ایسا لمحہ جس میں زندگی اور موت کے درمیان کی کیفیت شاعر پر مسلط ہے۔ اس لمحے کی عکاسی بھی گناہ نہیں۔ مگر عارف اس لمحے کو شعر میں خوب صورتی کے ساتھ منتقل کر کے الگ ہو جاتا ہے۔ "کرب" اور "برزخ" ایسی نظموں میں "آخری رات" کی سی کیفیت نہیں ملتی جب ؎

میرے جانباز رفیقوں کے درخشاں پیکر
میری تنہائی کو شرمانے چلے آتے ہیں

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عارف ایسے باشعور فن کار کے ذہن پر بھی ایسی کیفیتیں طاری ہو سکتی ہیں۔ اور اگر بحیثیت انسان، فن کار ان کیفیتوں میں سے گزرنے پر مجبور ہے۔ تو کیا ان کیفیتوں کو ان کے تاریخی پس منظروں سے الگ کر کے مجرد صورت میں دیکھنا درست ہے؟ یقیناً "کرب" اور "برزخ" کے لمحے انسانی زندگی کی محسوساتی حقیقتیں ہیں اور انہیں فن میں منتقل کرنا کوئی غیر فنی بات نہیں۔ مگر میرا مقصد صرف یہ ہے۔ کہ جب آج سے ڈیڑھ صدی پہلے میر تقی میر بھی ایسے لمحوں کی عکاسی کرتے ہوئے زندگی کی دوسری حقیقتوں کے ساتھ ان لمحوں کے رشتے کو اُجاگر کر کے سارے منظر کو چمکا سکتا ہے۔ تو ہم کیوں ایک مبہم تجریدیت کے شکار ہوں۔ مثلاً میر اپنے دل کی کیفیت بیان کرتے ہوئے صرف یہی کہنے پر اکتفا نہیں کرتا کہ ع

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے

بلکہ وہ یہ کہنا بھی ضروری سمجھتا ہے کہ ع

دل ہوا ہے چراغ مُفلس کا

اور یوں میر کا ذاتی درد کائناتی وسعتیں اختیار کر جاتا ہے۔

بہرکیف یہ ایک خاص دلچسپ بحث ہے۔ اور اس پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ عارف نے ان نظموں میں انسانی ذہن کی بعض خاص کیفیتوں کا اظہار کر کے غلطی کی ہے۔ سوال صرف نقطۂ نظر اور انداز فکر کا ہے۔ اور اگر شاعر کے نظریۂ فن کا علم نہ ہو۔ تو اس قسم کی نظموں کے مطالعہ سے عام قاری خاصی بڑی غلط فہمیوں کا شکار ہو سکتا ہے۔

البتہ ان نظموں کا ایک اور رُخ بھی ہے۔ اور وہ شاعر کی فکر ہے جس طرح میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ عارف عبدالمتین نے اپنے ہر موضوع کی گہرائی میں جانے کی کوشش کی ہے۔ ہر موضوع کے ساتھ چند روایتی مفروضے وابستہ ہوتے ہیں۔ اور ہماری عام شاعری کا دھرا یہ ہے۔ کہ انہی روایات کو اچنبھے میں ڈال دینے والی پینترے بازیوں کے ساتھ دُہرا دیا جاتا ہے۔ مگر عارف نے ہر روایت کو پرکھا ہے۔ اور پھر وہ ان موضوعات کی تہوں تک چھو آیا ہے۔ فکر اور سوچ کی یہ کیفیت اس کی نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی نمایاں ہے۔ "بحران"، "اندھیرے اُجالے" اور "طوفان سے پہلے طوفان کے بعد" عارف کی فکری شاعری کی کامیاب مثالیں ہیں۔

رہی عارف کی غزل تو اس میں وہ سب کچھ ہے۔ جو اردو غزل کی شاندار روایات کے مطابق نئی غزل میں ہونا چاہیئے۔ عارف نے غزلیں صحیح معنوں میں ڈوب کر کہی ہیں۔ اور اسی لیئے ان میں بندشوں اور ترکیبوں کے "نوادرات" کے بجائے محسوسات کی ایک دُنیا آباد ہے۔ یہاں میں کسی طویل تبصرے کے بجائے غزلوں کے صرف چند اشعار پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ انہی سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ عارف غزل میں اپنے بیشتر معاصرین سے کتنا آگے ہے۔ ع

تیرے خیال سے غافل ہو دل تو ڈوبتا جائے
ترا خیال جو کرے سنبھل سنبھل جائے

ہے زمانہ ہی بُرا! ہم بھلے تم بھی بھلے

رموزِ حُسن کچھ ایسے ڈھکے چھپے تو نہ تھے
یہ اور بات ہے، کچھ عشق ہی نے پہچانے

طوفانوں سے اُلجھے دل!

قطرے میں بہ جائے دل

جلاؤ خونِ شہیداں سے ارتقاء کے چراغ
یہ رسم چلتی رہی ہے، یہ رسم اب بھی چلے

اور صنفِ غزل کے بارے میں عارف کا نظریہ اس کی ایک غزل ہی کے اس شعر سے معلوم کیا جا سکتا ہے ؎

تری گفتار پر عالم فدا ہے
تری باتوں میں تیور ہیں غزل کے

عارف نے بعض ہیئتی تجربے بھی کیے ہیں۔ "درمیانی کڑی"۔ "یم بہ یم" اور "بحران" ان تجربوں کی چند مثالیں ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ تجربے محض جدت پسندی کی پیداوار نہیں ہیں۔ بلکہ عارف نے کوشش کی ہے کہ اس کے موضوعات نئی ہیئتوں میں زیادہ بامعنی اور پُرمایہ محسوس ہونے لگیں۔ طویل بحروں سے اسے بطورِ خاص لگاؤ ہے۔ اور اگرچہ چھوٹی بحروں کی طرح طویل بحروں میں بھی شاعر کی قدرتِ فن کو بہت کڑے امتحان میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور جس طرح چھوٹی بحروں میں ابہام کا خطرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح طویل بحروں میں بھرتی کی گنجائش ہوتی ہے۔ مگر عارف کی طویل بحروں والی نظموں اور غزلوں کا ہر ٹکڑا اپنی ضرورت اور اہمیت کا آپ ہی ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔

عارف نے اپنے فنی ارتقا کی ابتدائی منزلیں ایک جست میں طے نہیں کیں۔ اس کے فن کا تدریجی ارتقاء بے حد نمایاں ہے۔ میں ارتقاء کے اس منطقی تسلسل کو بڑی شاعری کی تخلیق کے لیے لازمی اور لابدی سمجھتا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے۔ کہ عارف ایک روشن مستقبل کی طرف بڑی خوداعتمادی کے ساتھ رواں ہے۔

ادیب کی آزادی

(۱)

دیویندر اِسّر

"مجھے آزادی دو یا مجھے موت دو"

آزادی یا موت ؛ ادیب کی زندگی میں ایک ایسا لمحہ بھی آسکتا ہے۔ جب اپنی ویژن سے خلوص کی خاطر اُس کے لیے آزادی یا موت میں انتخاب ناگزیر ہو جائے۔ اگر اس کی آزادیٔ فکر و تحریر سلب کر لی جاتی ہے۔ تو وُہ بخوشی موت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے کیونکہ بحیثیت ایک ایمان دار ادیب اور تخلیقی روح کے وہ بغیر آزادی کے زندہ لاش کی اذیت ناک زندگی بسر کرتا ہے۔ آزادی کے بغیر اُس کی تخلیقی قوت کبھی بروئے کار نہیں آسکتی۔ اس لیے آزادی یا موت کے علاوہ اُس کے سامنے تیسرا کوئی راستہ نہیں ہوتا آزادی کے بغیر زندگی موت ہے۔ لیکن پھر بھی ذہنی آزادی پر ہر قسم کی روک لگائی جاتی ہے۔ اور تعجب یہ ہے۔ کہ یہ روک آزادی کے تحفظ کے نام پر لگائی جاتی ہے۔ آزادی کے نام پر آزادی کو سلب کرنے کے لیے اتنے مجرمانہ فعل کیے گئے ہیں۔ کہ ان کی فہرست تیار کرنا ممکن نہیں۔ اور کبھی یہ بھی ہوا ہے۔ کہ آزادی کی تفسیر ایمانداری سے یا غیر شعوری طور پر ایسی کی گئی ہے۔ جس کا انجام غلامی کی صورت میں رُونما ہوا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا مدرسۂ فکر ہو جسے ادیب کی آزادی پر اعتراض ہو۔ لیکن کئی دو خیال آزادی کے مفہوم پر متفق نہیں۔ اس الجھاؤ کو دُور کرنے کے لیے صحیح آزادی اور سچی آزادی جیسے مُبہم الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ جب آزادی کی کوئی تسلی بخش تعریف پیش نہیں کی جا سکتی۔ تو پھر ہم اس قسم کی اصطلاحات میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ قانون، منطق، اخلاق اور فلسفہ ایک دوسرے سے اس طرح خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ کہ آزادی کا مفہوم خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ درحقیقت آزادی ایک کینفولک خیال ہے۔ آزادی کو سیاسی، معاشی یا سماجی نقطۂ نظر سے پیش کرنا کافی نہیں۔ آزادی کا دائرہ زندگی کے دائرے کی طرح وسیع ہے۔ آزادی زندگی کے ناتے کا مجموعہ ہے ہربرٹ ریڈ نے صحیح طور پر آزادی کی تفسیر کی ہے :-

"تحریر کی آزادی، مجلس کی آزادی اور تجارت کی آزادی ——— آزادی کے یہ سب استعمال میرے نزدیک غلط ہیں کیونکہ آزادی ایک مجرّد خیال ہے۔ ایک فلسفیانہ لفظ ہے"

آزادی کس سے اور آزادی کس لیے ؛ یہ سوال نہایت اہم ہیں۔ ان کا تسلی بخش جواب دیئے بغیر آزادی کی ماہیت پر غور کرنا دشوار ہے۔ جب ہم آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ تو ہمارے ذہن میں کسی روک کا تصوّر ہوتا ہے۔ جس سے ہم آزادی چاہتے ہیں۔ یہ روک کئی طرح کی ہو سکتی ہے۔ اخلاقی، سماجی، سیاسی، معاشی اور نفسیاتی۔ اس لیے آزادی کی نوعیت بھی مختلف ہو سکتی ہے۔ وقت اور مقام کے مطابق ہر آدمی کی آزادی کا تصوّر بدلتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عین اس وقت جب ہم سمجھتے ہیں۔ کہ آزادی ہماری گرفت میں ہے۔ وُہ ہم سے دُور جا چکی ہوتی ہے۔ کیونکہ ہم آزادی کی فلسفیانہ ماہیت سے واقف نہیں۔ دراصل آزادی کا سوال بنیادی طور پر انفرادی اور فلسفیانہ نقطہ

نظر کا حاصل ہے۔ اگر ہم اسے سیاسی و سماجی سوال سمجھ کر علومیت میں بدل دیتے ہیں۔ تو ہم کچھ دوسری رکاوٹوں سے آزادی حاصل کرنے کی خواہش میں نئی رکاوٹیں قبول کر لیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے۔ کہ خارجی طور پر کامل آزادی کا کوئی وجود نہیں۔ لیکن پھر بھی ادیب لاڈ ایکسٹن کا ہم نوا ہو کر کہہ سکتا ہے۔

"آزادی سے میری مراد یہ یقین ہے۔ کہ ہر آدمی جبر، اکثریت، رسم اور رائے کے اثرات کے خلاف اپنے اعتقاد کے مطابق اپنے فرض کی ادائیگی کر سکتا ہے۔"

آزادی کا مفہوم ہر دور میں یکساں نہیں رہا۔ مثال کے طور پر روسو ترقی یافتہ سیاسی اداروں، بادشاہوں، سلطنتوں اور گرجاؤں سے آزادی کا خواہاں تھا۔ اس کے خیال میں یہ آزادی صرف اس وقت حاصل ہو سکتی ہے۔ جب ہم زیادہ ابتدائی اور فطری زندگی کی طرف لوٹ جائیں۔ روسو کے اس رومانٹک نظریے کے برعکس ترقی پسند شکلیف کی رائے میں آزادی کا مطلب بھوک، جہالت، توہمات، عدم تحفظ اور ابتدائی فطری زندگی سے مُبرّا ہونا ہے۔ آزادی کے یہ دونوں نظریے آزادی کے متضاد رُخ پیش کرتے ہیں۔ رومانٹک ادیب فطرت کی گود میں لوٹ جانا چاہتے ہیں۔ ایک ایسی فطری زندگی میں جہاں موجودہ تہذیب یافتہ سیاسی اور معاشی ادارے نہیں ہوں گے۔ لوگ مہذب نہیں۔ بلکہ شریف وحشی ہوں گے۔ بقول روسو کے انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔ مگر ہر جگہ پابہ زنجیر نظر آتا ہے۔ لاک کے خیال میں بھی لوگ فطری حالت میں عقل کے مطابق رہتے تھے۔ انہیں زندگی، جائداد اور آزادی کے حقوق حاصل تھے۔ آجکل بہت سے ناول ایسے لکھے جا رہے ہیں۔ جو موجودہ تہذیب کے تصنع اور مصنوعیت کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ اور جن میں یہ خواہش ظاہر کی جاتی ہے۔ کہ وہ گھاس پر برہنہ لیٹ جائیں، ننگے پاؤں زمین پر گھومیں۔ اپنی جبلتوں کے تقاضوں کو فطری طور پر بغیر کسی سماجی بندش اور اخلاقی روک کے مطمئن کرتے رہیں۔ ان کے خیال میں جدید تہذیب انہیں اپنے رسم و رواج میں جکڑ کر سطحی، مصنوعی اور کھوکھلا بنا رہی ہے۔ آزادی کا یہ رومانٹک تصور امریکی ناولوں میں زیادہ نمایاں ہے۔ جہاں تہذیب مشینی دور کی غلام بن کر انسانی حیات کو کُند کرتے کرتے ختم کر رہی ہے۔

ترقی پسند مدرسۂ فکر فطری آزادی کو فطرت کی غلامی سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے۔ کہ سائنس کی ترقی سے انسان فطرت کو اپنی بہبودی کے لیے استعمال کر کے انسانی زندگی کی تکمیل کر سکتا ہے۔ صنعتی انقلاب، علم کی اشاعت اور سائنس کی آزادی دیتا ہے۔ اور مستقبل کو تعبیر کے قابل بناتا ہے۔ جبکہ رومانٹک مفکر ماضی کی تاریکیوں میں لوٹ جانا چاہتا ہے۔ ترقی پسند مفکر فطرت میں پناہ لینے کے بجائے فطرت پر غالب آ کر آزاد ہونے کی تمنا کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے۔ کہ آزادی کا تصور، بندش کے تصور سے وابستہ ہے۔ کیونکہ بندش کے تصور میں اختلاف رائے ہے۔ اس لیے آزادی کا جامع اور کامل نظریہ پیش کرنا ممکن نہیں۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے عام طور پر آزادی کے ساتھ معاشی یا سیاسی، جیسی اصطلاحات وابستہ کر دی جاتی ہیں۔ جس سے مسئلہ سمجھنے کے بجائے اور اُلجھ جاتا ہے۔ کیونکہ ان اصطلاحات میں بھی اسی طرح کا اختلافات موجود ہے۔ برٹش ہاؤس آف کامنز کی ایک دلچسپ مثال ہے:۔

Q. Is it true that workers have been dismissed?

Answer. No Sir, labour has been released.

اس مثال سے ظاہر ہے۔ کہ سرمایہ پرستی میں معاشی آزادی سے مُراد Laissez faire یعنی آزاد چھوڑ دو ہے۔ انفرادیت پسندوں کے خیال میں ریاست کو لوگوں کی زندگی میں کم سے کم دخل دینا چاہیے۔ تب ہی زیادہ سے زیادہ لوگ زیادہ سے زیادہ خوشی حاصل کر

سکتے ہیں۔ اس لیے سیاسی آزادی کے لیے معاشی آزادی لازمی ہے۔ اس کے برعکس اشتراکی مدرسۂ فکر کے مطابق جب تک انسان کی بنیادی، اقتصادی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں اور معاشی مساوات قائم نہیں ہوتی سیاسی آزادی ایک واہمہ ہے۔ ایک طرف جان اسٹورٹ مل اور ہربرٹ اسپنسر کا معاشی آزادی کا تصور ہے۔ اور دوسری طرف مارکس اور لینن کا تصور ہے۔ ٹریجیڈی یہ ہوئی۔ کہ دونوں طرز نظاموں میں نہ معاشی آزادی ہے اور نہ ہی سیاسی آزادی اور لوگ ایک غلامی سے نجات پاکر دوسری غلامی کا شکار ہو گئے ہیں

یوں تو کوئی آدمی بھی مکمل طور پر آزاد نہیں ہو سکتا۔ خارجی طور پر بھی اور داخلی طور پر بھی ہر انسان ورثے، خاندان، پرورش، ماحول اور اپنی نفسیاتی ساخت کا غلام ہوتا ہے۔ اور حالات میں تبدیلی لانے کی قوت اور آزادی اسے بہت کم میسر ہوتی ہے۔ آدمی کچھ نفسیاتی مجبوریوں اور غیر شعوری محرکات کے زیرِ اثر زندگی بسر کرتا رہتا ہے۔ لیکن پھر بھی آزادی کا احساس پیدا ہو سکتا ہے۔ (کامل آمریت میں آزادی کے داخلی احساس کو بھی ختم کر دیا جاتا ہے) اور اس احساس کا اظہار کرنا لازمی ہے۔ اس لیے آزادی کے دو پہلو ہیں۔ داخلی اور خارجی اور اسی باعث آزادی کی تفسیر داخلی اور خارجی پہلوؤں سے ہی مکمل ہو سکتی ہے۔ داخلی طور پر آزادی کا احساس تب پیدا ہوتا ہے۔ جب ہمیں اپنی خواہشات اور من کی موج میں بغیر کسی جبر اور مجبوری کے حصہ لینے کا موقع ملے۔ جب ہم اپنی کمزوریوں سے کسی ایک پر غالب آجاتے ہیں۔ اور بندش میں تبدیلی محسوس کرتے ہیں۔ خارجی آزادی کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ یعنی بغیر سماجی، سیاسی اور معاشی تشدد کے اظہار کی آزادی ادیب کے لیے ناگزیر ہے۔ بقول ملٹن کے۔

"مجھے تمام آزادیوں سے زیادہ اپنے ضمیر کے مطابق آزادانہ ادراک اظہار اور بحث کی آزادی دو"

آزادیِ فکر اور آزادیِ اظہار لازم و ملزوم ہیں۔ صدیوں کی جدوجہد کے بعد تسلیم کیا گیا ہے۔ کہ اظہار کی آزادی انفرادی آزادی کا لازمی جزو ہے۔ اس کا ایک منطقی پہلو یہ بھی ہے۔ کہ جو لوگ سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور سماجی تحفظ کے لیے اس آزادی کو سلب کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے ذہن میں قطعی طور پر یقین کر لیتے ہیں۔ کہ ادیب کی رائے غلط ہے۔ مکمل طور پر اپنی رائے کو صحیح تسلیم کرنا ذہنی غلامی کی نشانی ہے۔ ایسے لوگ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کہ وہ غلطی سے مبرا نہیں ہو سکتے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے۔ کہ عام طور پر ایسے لوگ غلطی میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور جن لوگوں کو دار و رسن کا شکار ہونا پڑا ہے۔ وہ سچے ثابت ہوئے ہیں۔ اظہار کی آزادی دینے کے لیے صرف یہی ایک نقطہ کافی ہے۔ کہ آزادی کو سلب کرنے والے لوگ صحیح ہو سکتے ہیں۔ یا کسی حد تک صحیح اور کسی حد تک غلط۔ اس لیے اگر وہ صحیح بھی ہیں۔ تو بھی انہیں یہ اختیار نہیں دیا جا سکتا۔ کہ وہ دوسرے کی آزادی سلب کر لیں۔ کیونکہ ابھی تو یہ فیصلہ ہی نہیں ہوا۔ کہ وہ صحیح ہیں۔ اور اگر وہ غلط ہیں۔ تو انہوں نے ایک صداقت کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ لوگ اپنی نیک نیتی اور ایمانداری کی دہائی دے سکتے ہیں۔ اور کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ کام انہوں نے اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق کیا ہے۔ لیکن وہ یہ کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ دوسرے نے جب اپنی آزادی کا استعمال کیا ہے۔ تو اس نے بھی اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق ہی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کیا غلطی کے احتمال سے ڈر کر ہم اپنی عقل کا استعمال بند کر دیں۔ جب کہ وہ اپنی عقل کے مطابق دوسرے کی رائے کو سماج اور قانون کے لیے مضر سمجھتے ہیں۔ اور وہ واقعی مضر ثابت ہوتی ہے۔

اگر ایسے لوگ صحیح بھی ہیں۔ تو بھی کسی رائے کو ختم کرنا حماقت ہے کیونکہ عقلی طور پر یہ کامل یقین تب ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جب ہم اس رائے پر آزادانہ بحث و مباحث کے مواقع مہیا کرتے ہیں۔ اور ثابت کرتے ہیں۔ کہ اس سے انحراف ممکن نہیں۔ مگر اس

رائے سے ذہنی طور پر بھی انحراف کی گنجائش ہے۔ تو اسے جبر و تشدد سے اور آزادی کو سلب کر کے عمل میں نہیں لایا جا سکتا۔ اور اگر دونوں مختلف رائیں اپنے اندر کچھ ضروری صداقت رکھتی ہیں۔ تو دونوں کو نہ صرف برداشت کرنا ضروری ہے۔ بلکہ اُن کی اشاعت کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ بقول جے۔ بی۔ بیری :-

"مادی اور اخلاقی ترقی کی ایک اعلیٰ شرط جس کا حصول مکمل طور پر اس کی قوت میں ہے۔ فکر اور مباحثہ کی کامل آزادی ہے۔ علم کی ترقی اور غلطیوں کی اصلاح کے لیے بے روک آزادی لازمی ہے۔...... ایک بار جب آزادی فکر کے اصول کو سماجی ترقی کی اعلیٰ شرط تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ تو یہ عام مصلحت کے دائرے سے نکل کر ارفع مصلحت کے دائرے میں شامل ہو جاتا ہے۔ جسے ہم انصاف کہتے ہیں۔"

اس قسم کا خیال جان اسٹورٹ مل نے بھی ظاہر کیا ہے۔

"اخلاقی اعتقاد کے طور پر ہر نظریے میں عقیدے اور بحث کو مکمل آزادی ہونی چاہیے۔ چاہے وُہ کتنا ہی منافیِ اخلاق کیوں نہ تسلیم کیا جاتا ہو۔"

آزادی سلب کرنے میں ایک یہ اصول بھی کارفرما ہے۔ کہ اگر کسی بڑی بُرائی کو روکنے کے لیے کوئی معصوم بھی تختۂ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ تو یہ جائز ہے۔ اور یہی وُہ نظریہ ہے۔ جس سے انفرادی آزادی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اور ادیب اور ریاست کا ابدی بُعد شروع ہو جاتا ہے۔ جبر دو برائیوں میں سے ایک کا انتخاب ہے۔ یہ دو بُرائیاں تشدد اور خطرناک خیالات کی ترویج ہیں۔ ادیب ترویج کو تشدد پر ترجیح دے گا۔ کیونکہ خطرناک خیالات کا فیصلہ تو صرف تاریخ کے ہاتھ میں ہے۔ اور ویسے بھی وُہ رائے جسے دبا دیا گیا ہو۔ جابر کی رائے سے زیادہ خطرناک ہے۔

اگر ریاست عقل، وجدان، تخیل، مشاہدہ، تجربہ اور مباحثہ سے حاصل کیے ہوئے ادیب کے شعور کو شک کی نظر سے دیکھتی ہے تو ذاتی ضمیر کی آزادی اور بحث و مباحثہ کی سماجی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لیے ادیب بھی اہلِ اقتدار پہ عدم یقین کا اظہار کرنے میں حق بجانب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب کم از کم خیالی سطح پر آزادی کے لیے ریاست کے وجود کو انارکسٹ سماج سے زیادہ مُہلک سمجھتا ہے

رُت آئے رُت جائے

ظہور نظر

رُت پل چھن ہے پل چھن رُت ہے
کون اک رُت سے پریت لگائے
میں ہوں ہر رُت کا متوالا —،
ایک روپ موہے کیسے بھائے

بھور بھئے تو زل جل کا سینہ چیر کنول کھل جائے
کھلے کنول تو بھنورا آئے جھومے، ناچے گیت سنائے
گُن جھم گُن جھم سُن بھنورے کی نیل کنول کا من گھبرائے
ہولے ہولے دونوں کی تن جوالا بھڑکے راس رچائے
شام بھئے تو لوبھی بھنورا

تن مدھرا سے بھر اُڑ جائے
پنکھڑیوں کا انگ انگ تھک جائے نیل کنول مرجھائے
اس انیائے پہ اوس بچاری بھور سمے تک نیر بہائے
بھور بھئے تو پریت اوس کی توڑ کنول دوجا کھل جائے
کھلے کنول تو بھنورا آئے جھومے ناچے گیت سنائے

رُت پل چھن ہے پل چھن رُت ہے
کون اک رُت سے پریت لگائے
میں ہوں ہر رُت کا متوالا —،
ایک روپ موہے کیسے بھائے

تہِ کمندِ بہار

ساقی فاروقی

خورشیدِ جہاں تاب تجھے یاد تو ہوں گے
گزری ہوئی صدیوں کے درخشندہ خد و خال
ہیں تیری ضیا پاش شعاعوں کی نظر میں —،
خوشحال شب و روز، غزل گاتے مہ و سال
گمنام جزیروں پہ دمکتے ہوئے ہیرے
گلہائے بنفشہ سے مہکتے ہوئے پنڈال
خورشیدِ جہاں تاب تجھے یاد تو ہوں گے
گزری ہوئی صدیوں کے درخشندہ خد و خال

کشمیر کے شمشاد قد اِک غنچہ دہن — شوخ
ہونٹوں پہ تقدس لیے ایران کے مہتاب
یونان کے سب سے بڑے فن کار کے آدرش
اسپین کے قلاش ادیبوں کے حسیں خواب
آنکھوں کے دریچوں میں وفاؤں کے ستارے
سینوں میں دھڑکتے ہوئے اخلاص کے آداب
خورشیدِ جہاں تاب تجھے یاد تو ہوں گے
گزری ہوئی صدیوں کے درخشندہ خد و خال

خورشید بتا دے وہ شب و روز کہاں ہیں؟
رانجھے سرِ مقتل ہیں تو ہیروں پہ ہیں پہرے
گم گشتہ بہاروں کی خبر ہے کہ نہیں ہے؟
کہتے ہیں کہ خوشبو کے ذخیروں پہ ہیں پہرے
آتی ہیں شعاعیں ذرا کتراتی ہوئی سی،
ان تیری صبا چال سفیروں پہ ہیں پہرے
خورشیدِ جہاں تاب تجھے یاد تو ہوں گے
گزری ہوئی صدیوں کے درخشندہ خد و خال

ساون کے انگارے

مختار ملسیانی

پھر امڈ آئے ہیں یادوں کے سہانے بادل
پھر دلِ زار میں اک شعلۂ ارماں جاگا
میرے افکار کے بجھتے ہوئے دیپ چونکے
میری نظموں کا سُلگتا ہوا عنواں جاگا

ہلکے جھونکوں میں تری زُلفِ پریشاں کا خمار
بجلیاں، جیسے ترے کان کا بالا چمکے
دُور یادوں کے مہکتے ہوئے جنگل میں کہیں
جیسے چھوٹا سا بہاروں کا شوالا چمکے

وقت کے ہاتھ میں لہراتا ہے رم جھم کا رباب
دُور تک ایک نشیلا سا فسوں طاری ہے
اے مچلتے ہوئے لمحو! ذرا ہوشیار رہو
آج کی رات خیالوں پہ بہت بھاری ہے

جس میں یادوں کا تسلسل، نہ ستاروں کا ظہور
ایک بھیگا ہوا آنچل سرِ بازو جیسے
آج کی رات مرے داغِ تمنا کو نہ دیکھ،
پاس ہی ڈوبا ہوا چاند کا ابرو جیسے

منتظر ہوں کسی آوارہ گھٹا کی ڈولی —،
میرے تپتے ہوئے آنگن میں اتر آئے گی
اور گرجتے ہوئے، چڑھتے ہوئے طوفانوں میں
صبحِ دوراں کی نئی راہ نظر آئے گی،

چھپ کے آئے گا کوئی حسنِ تخیّل کی طرح،
آج کی رات چراغوں کا جلانا ہے منع
کھول دو ذہن کے سہمے ہوئے دروازوں کو
آج جذبات پہ پہروں کا بٹھانا ہے منع،

کوئی ہوگا نہ یہاں تشنہ لبی پر مجبور
کہہ گیا جھوم کے مجھ سے یہ برستا ساون
دے گیا وقت کے پیغام مجھے چپکے سے
کتنا معصوم تھا مختار یہ ہنستا ساون

گیت

(پنجابی)

فیض احمد فیض

سیتو ٹٹ گئی ماہل چرکھڑے دی،
میتھوں کتیا ناں جائے ہور نی ـــــ
سیتو میں نیہوں لا کے بھُلّی
تند تڑکلے پا کے بھُلّی
کچے دھاگے وانگوں سی ہار ئے
ساہنبھ دی کچی ڈور نی، ـــــ
پا کے رونے میرے پُتّے
ماہی ہور ٹکانے تکّے
ہوسی دل دا محرم اوہو،
بنیا دل دا چور نی، ـــــ
میں اَن انجول ساں، تسیں نہ بھُلّیو
مٹھیاں گلّاں تے ناں ڈُلّیو
میری تینو، پیار نہ کریو
پیار بڈاں دا کھور نی، ـــــ
سیتو ٹٹ گئی ماہل چرکھڑے دی
میتھوں کتیاں ناں جائے ہور نی،

پھولوں کے پاس

انور سجاد

ایریزونا میں روشنیوں کا بسیرا تھا

لوگ ہال میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ہال کے بائیں طرف اس ریستوران کی بار ہے۔ بار میں کاونٹر پہ ایک طرف بیئر اور وسکی کی بوتلیں اور اور دوسری طرف مگ اور گلاس پڑے تھے۔ فلورسینٹ کی ٹھنڈی نیلی روشنی میں چند لوگ اپنے سامنے وسکی کا گلاس یا بیئر کا مگ رکھے، ایک دوسرے کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ دو آدمیوں نے بیئر کے جگ خالی کئے اور مسز کاؤس جی تاڑی والا کو کاؤنٹر پہ بل ادا کر کے مسکرا کے اُسے سلام کرتے، مڑتے چلے گئے ——— جس طرح ریل گاڑی میں سے چند مسافروں کے اُترنے سے کوئی فرق نہیں آتا۔ اسی طرح ان کے جانے سے ایریزونا کی بوجھل اور بھنبھناتی، ہوئی فضا میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔

مسز کاؤس جی تاڑی والا کے گدّے دار جیسے بازو نیم دائرے کی شکل میں آہستہ آہستہ متحرک تھے ——— وہ جذبات سے عاری ہو کر جھاڑن سے کاؤنٹر صاف کر رہی تھی۔

ڈیلیا پھولوں سے سجے کونے میں ایک خالی صوفے کے دائیں طرف آرام کرسی میں ایک لڑکی ہتھیلی پہ ٹھوڑی رکھے بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھیں نیلی تھیں، لیکن اُس نیلی جھیل ایسی نہیں جس میں ٹیگور کا دل ڈوب جانے کی خواہش کیا کرتا تھا ——— اُس کی آنکھیں گرم صحرا کی مانند پھیلی تھیں، جن میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں تھا۔

اس لڑکی کے سامنے، ایک لاغر سا گندمی رنگ کا آدمی بیٹھا تھا۔ اُس کی داڑھی پہ بال کچھ ایسے تھے جیسے کسی نے سرمئی بالوں کا گچھا بڑی لاپروائی سے اُس کی ٹھوڑی پر چپکا دیا ہو۔ اس کی لمبی خون سے محروم بے جان انگلیوں میں ایک رنگدار چاک تھا جس سے وہ اس لڑکی کی تصویر بنا رہا تھا۔ میز پر وسکی کی بوتل کے پاس چاکوں کے ڈبے کے نیچے، اس لڑکی کی دو تصویریں اور پڑی تھیں جنہیں دیکھ کر یہ اندازہ مشکل ہو جاتا تھا کہ اُن بولتی ہوئی تصویروں نے انہی بے جان انگلیوں سے زندگی حاصل کی ہے۔

جانے وہ لڑکی بے چینی سے ہل جُل کیوں رہی تھی۔ اُس آدمی نے اُس کو پہلے بھی کئی بار ہلنے سے منع کیا تھا۔ کیونکہ وہ چہرے کے اہم حصّے میں شیڈ دے رہا تھا۔

"ممّی پلیز، ناک سے رومال ہٹاؤ۔"

ممّی نے ناک سے رومال ہٹاتے ہوئے کہا "منصور تم بہت بور ہو ——— بھلا یہ کیا مذاق ہے۔ خواہ مخواہ مجھے یہاں لا کر بٹھا دیا ہے ——— کلب میں اتنا انجوائے کرتی ——— بائی گاڈ اگر مجھے علم ہوتا تو کبھی نہ آتی۔"

حقیقت بھی یہی تھی، اگر ممّی کو یہ پتہ ہوتا کہ منصور اُس کو یہاں لا کر مجسمہ بنا کر بٹھا دے گا۔ تو وہ کبھی نہ آتی۔ اس کا خیال تھا کہ منصور نے جو اتنے اشتیاق سے اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا ہے تو یقیناً وہ ایک اچھا ساتھی ثابت ہوگا۔ اور اسی طرح اچھی اچھی باتیں کرے گا جیسے کلب میں کر رہا تھا لیکن وہ خاموش تھا۔ منصور کا سمو پالیٹن کلب میں اپنے ایک دوست کے ساتھ رمی کھیل رہا تھا کہ ہال کا دروازہ کھلا، اور ممّی اندر

میں ٹینس کا ریکٹ لئے داخل ہوئی۔ منصور کی نگاہیں اس کے چہرے پر اٹک کر رہ گئیں۔ اس نے اپنے دوست سے اس کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ اس کلب کی زندگی ہے اس نے آتے ہی منصور کے دوست سے سگریٹ مانگا۔ دوست نے سگریٹ دے کر دونوں کا تعارف کرایا۔ ٹمی اس کے پاس بیٹھ گئی۔ منصور نے دس دس کے نوٹ اپنی جیب میں رکھ لئے اور رمی کا کھیل ختم ہو گیا۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی لیکن منصور اُسے گھورتا ہی رہا۔ جانے اس کی نگاہیں ٹمی کے چہرے میں کیا ڈھونڈ رہی تھیں۔

پھر منصور کا دوست بیڈمنٹن کھیلنے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد منصور کو یوں محسوس ہوا جیسے ٹمی بڑی مدت سے اس کی واقف ہے۔ وہ خاموشی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر لمبی لمبی مخروطی انگلیوں کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے بڑی اُداسی سے مسکرا کر اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ ٹمی نے کہا۔

"کوئی یاد آ گیا آپ کو ——— ؟"

"دنیا میں ایسا کوئی نہیں جسے میں یاد کر سکوں۔"

امپاسیبل ——— ! میں نہیں مانتی ——— ناممکن ——— آپ انسپیریشن کیسے حاصل کرتے ہونگے ؟"

"مجھ بوڑھے کو کون پوچھتا ہے ——— ؟" وہ مسکرایا "ویسے تمہاری ناک، چہرے کی بناوٹ اور ہونٹ کچھ ماڈرن سے ہیں ——— تم پہلی لڑکی ہو جس سے میں متاثر ہوا ہوں۔"

ٹمی کے چہرے پر حیا کی وہ سرخی جھلک آئی، جو اس نے کافی مشق کے بعد ہر ایک کے سامنے پیدا کرنا سیکھی تھی۔

"مجھے معمر لوگ بہت پسند ہیں، نوجوانوں سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔"

"تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ میں تمہارا پورٹریٹ بناؤں گا۔"

منصور کے اصرار پر وہ مان گئی۔

تھوڑی دیر تک وہ شاپنگ کرتے رہے پھر منصور نے اپنے گھر سے چاکوں کا ڈبہ اور کاغذ اٹھائے اور اسے ایریزونا کے بار روم میں لے آیا۔ کیونکہ کلب میں اس کے واقف خلل انداز ہوتے تھے۔

پہلے پہلے تو ٹمی بڑے اطمینان سے بیٹھی رہی۔ مگر جب وہ منصور کی خاموشی سے اُکتا گئی تو اس نے جانا چاہا۔ منصور نے شراب کی بوتل اور اس کو خرید کر دیئے ہوئے تحائف کی طرف اشارہ کر کے پُر وقار انداز میں کہا۔

I HAVE PAID YOK

اور ٹمی بے بس ہو کر بیٹھ گئی۔

منصور نے اس کی پہلی تصویر بنائی تو یوں محسوس ہوا تھا۔ جیسے ٹمی آئینہ دیکھ رہی ہے۔

دوسری تصویر میں آنکھوں کا رنگ نیلا ہونے کی بجائے شربتی تھا۔ ٹمی نے کہا ——— "میری آنکھیں ایسی تو نہیں اور میرے گالوں میں ڈمپل بھی نہیں۔ منصور خاموش تھا۔

"ڈیئر وسکی ختم ہو گئی ہے۔ ایک بوتل اور منگوا دو نا ——— بیرا ———"

منصور کے کان کسی بھی آواز کو قبول نہیں کر رہے تھے اور دل اور دماغ اس وقت چاک کی نوک میں تھے۔ وہ تصویر میں پلکیں بنا رہا تھا۔ چاک کی نوک ذرا ذرا سی کھسکتی ہوئی گھنی پلکوں کو مکمل کر رہی تھی۔ اس کا دماغ کاغذ کے پھیلتے ہوئے چاک سے نکل کر

ماضی کے پردوں کے پیچھے چلا گیا تھا۔ جہاں دو شفاف کٹورا سی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ وہ آنکھیں جو محبت کا جھرنا تھیں، جو احساسات کی کائنات اور خلوص کا مجسمہ تھیں۔ اُن آنکھوں نے اس کو دیکھا تھا اور ان سے محبت کی تھی۔ اس نے سیمی کو اپنے مرغوب لباس میں دیکھا۔ اُس نے اس کشمکش کو مجسم دیکھا جس نے اسے اور سیمی کو اپنی لپیٹ میں لے کر آگ کی طرح جھلس دیا تھا۔ منصور نے ان چاند ستاروں کو دیکھا جن کی روشنی سے وہ کائنات بھر کی مسرتیں حاصل کرتے رہے تھے۔ پھر اُس نے ابھرتے سورج کی ان کرنوں کے لمس کو محسوس کیا۔ جن کے دامن میں سیمی نے کہا تھا۔

"تم اپنے فن سے دنیا کو سورج کی طرح منوّر کرو گے۔"

اور اُس نے بتایا تھا "سیمی ——— میں تمہارے ساتھ رہ کر تاریکیوں میں رہنا بھی گوارا کروں گا۔ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے۔"

اور منصور نے کہا "تم سے مجھے بے پناہ محبت ہے۔"

مِٹی نے گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا ——— "واقعی؟"

منصور نے سیمی سے کہا ——— "مجھے اپنے فن کی قسم۔"

مِٹی نے کہا "گڈ گوش" ——— "اتنی جلدی" اور اس نے گلاس منہ سے لگا لیا۔

ہلکا گلابی چاک گالوں میں حیا کی سرخی دینے کے بعد ڈبے میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جا ملا۔ منصور کا ہاتھ بوتل کی طرف بڑھا اور گلاس وسکی سے بھر گیا۔ اس نے ایک گھونٹ پینے کے بعد گلاس میز پر رکھا اور پیلا چاک اٹھا لیا۔ اُس کی نگاہیں تصویر کی طرف لوٹتی ہوئی پھولوں والے کونے میں اٹک گئیں۔ پھولوں کے ایک قریبی خالی صوفے پر ایک مسکراتا ہوا نوجوان بالکل ساکت بیٹھا تھا۔ اُس کی مسکراہٹ اُن پھولوں سے بھی زیادہ شگفتہ تھی۔ اس کے لمبے لمبے گندمی ہاتھ پھولوں پر بیٹھی تیتریوں کی مانند میز پر پڑے تھے۔ اُس کی فرنچ کٹ داڑھی اُس کی ٹھوڑی پر بڑی خوبصورتی سے جمی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں تاریک راتوں کی وہ امید بھری روشنی جگمگا رہی تھی۔ جو چاند نہ ہونے کے باوجود جانے کہاں سے آ جاتی ہے۔

اُس مسکراتے ہوئے آدمی نے اُس کے کان میں سرگوشی کی "شراب پی کر تم زندگی سے تو فرار حاصل کر سکتے ہو مگر فرار سے کس طرح فرار حاصل کرو گے ———" منصور نے گھبرا کر شراب کا گلاس پھولدان میں انڈیل دیا اور اس کی طرف کھوئی کھوئی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اُس شخص کے ہونٹ مسکراہٹ سے پھیل گئے۔ منصور کو یوں محسوس ہوا جیسے اس اجنبی کے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ "اس لڑکی کو یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ ساری زندگی تم نے اپنی محبت کو مختلف لڑکیوں کے بھینٹ چڑھایا ہے۔ کیا اس طرح سیمی کی غیر موجودگی میں تمہاری زندگی کا خلا پُر ہو گیا ہے۔ میں نے پہلے بھی تمہیں کہنا چاہا مگر تم نے مجھے موقع ہی نہیں دیا۔ پگلے تم نے اپنی محبت کو داغدار کر لیا ہے۔"

پھر منصور نے جیسے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی ——— اجنبی کے ہونٹ زہرخند میں ڈوب گئے۔

مِٹی کے ماتھے پر بار بار سلوٹیں پڑ جاتیں اور اُس کو یوں محسوس ہوتا جیسے منصور ایک گھٹیا سا مداری ہے جو ایک ہی کھیل بار بار دکھا کر اسے بور کر رہا ہے ——— گذشتہ دو گھنٹے سے وہ خاموش بیٹھا تصویریں ہی بنائے جا رہا تھا ——— اُس نے سوچا "میں نے معمولی سے تحفوں کی خاطر یونہی اپنا وقت ضائع کیا۔ اور خان بہادر سے بھی اسی احمق کی خاطر نہ ملی ——— شاید وہ آج مجھے گولڈ سمتھ سے ہار لے دیتے۔" وہ

خان بہادر موصوف اس لئے نہ ہی تھی۔ کہ وہ اپنی جوانی کے قصے دہرا کر اس کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتے تھے ——— "پور اولڈ گائی" اور منصور کی رفاقت کو اُس نے اس لئے خوش گوار سمجھا تھا۔ کہ وہ نوجوانوں کی طرح شوخ اور بوڑھوں کی طرح سنکی نہیں تھا۔ اب وہ اُس وقت کو کوس رہی تھی جب وہ اُس کے ساتھ آئی تھی۔

مسٹر کاؤس جی ٹاڈی والا نے ماحول سے اُکتا کر ایک سگریٹ اپنے لبوں میں رکھا اور دیا سلائی جلائی۔ ایک لحظہ کے لئے اُس کے چہرے کی ہلکی ہلکی جھریاں نمایاں ہو گئیں۔ لیکن پھر فوراً ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے دیا سلائی بجھ گئی۔ کیونکہ ٹھگنے قد کا ایک آدمی بڑے زور سے دروازہ کھول کر بھونرے کے مانند اندر آیا۔ اُس نے آتے ہی خالی بوتلیں کاونٹر پر رکھیں اور بلند آواز میں کہا "گڈ ایوننگ مسٹر کاؤس جی ——— بڑی پیاری رات ہے ——— بہت ہی اچھی ——— ترش اور شیریں ——— چیئرز ——— شکریہ ——— تمہیں اتنی اچھی رات میں بڑبڑانا نہیں چاہیئے ——— ہاں ——— آر یو آل رائٹ؟ ——— خوب خوب خوب ——— میں چلا بیگم میری منتظر ہو گی ——— شکریہ ——— گڈ نائٹ"۔
اور مسٹر کاؤس جی ٹاڈی والا نے جھلا کر سگریٹ سلگا لیا۔

اُس آدمی کی آواز نے بار روم کی فضا کو درہم برہم کر دیا تھا۔ لیکن یہ خلل اندازی منصور کے کام میں حارج نہ ہوئی۔ کیونکہ اُس کے نزدیک اُس کی اہمیت اتنی ہی تھی جیسے سڑک پر کوئی کار ہارن بجاتی گذر جائے۔ وہ اپنے گردوپیش سے بے خبر تصویر کے ہونٹوں میں ہونا لیزا کی مسکراہٹ ایسی دل کشی پیدا کر رہا تھا ——— ہونٹوں کے بائیں کونے میں سیمی کی مخصوص مسکراہٹ کروٹیں لے رہی تھی ——— وہی مسکراہٹ جو اُس کی سالگرہ پر چھلک رہی تھی۔

سیمی نے کیک پر لگی جیسی موم بتیاں بجھائیں اور اُس کے ساتھ کھڑے گھنگھریالے بالوں والے نوجوان نے اچانک اُس کے ہاتھ میں چھری دے کر اس کا ہاتھ پکڑے کیک کاٹا اور منصور کو یوں محسوس ہوا جیسے گھنگھریالے بالوں والے لڑکے نے سیمی کا ہاتھ پکڑ کر کیک نہیں بلکہ اُس کے دل کو کاٹ دیا ہے ——— کمرہ تالیوں سے گونج اٹھا اور منصور نے بھی ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ بہت آہستہ آہستہ تالی بجا کر دوسروں کا ساتھ دیا۔

سیمی کے گلے میں منصور کا دیا ہوا لاکٹ جگمگا رہا تھا۔ جو اُس نے رات کا کھانا بند کر کے اور دن رات کینوسوں کو اپنا خون دے کر خریدا تھا۔ اور دیر تک وہ اس لاکٹ کی قیمت قسطوں میں بھی ادا کرتا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سیمی آئی اور اُس سے اُداسی کی وجہ پوچھی۔ منصور نے کہا۔

"سیمی ——— وہ گھنگھریالے بالوں والا کون ہے ——— ؟"

"میرا خالہ زاد بھائی، کیوں"

"کچھ نہیں ———"

سیمی نے اپنے خالہ زاد بھائی کو بلا کر منصور سے تعارف کرایا ——— مسٹر اکرم ——— اور مسٹر منصور بہت بڑے پینٹر اور میرے کلاس فیلو"

اس معصوم سی لڑکی نے اپنے ابا سے یہی کہہ کر کہ وہ اُس کا کلاس فیلو ہے اُسے دعوت میں بلایا تھا۔

اکرم نے خندہ پیشانی سے کہا "ہاؤ ڈو یو ڈو"

تھوڑی دیر بعد اکرم رسمی باتیں اور اس کی تصویروں کی تعریف کر کے چلا گیا اور سیمی نے لاکٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا "تمہارا تحفہ سب سے اچھا ہے"

منصور نے سیمی کے سامنے اکرم کے متعلق اپنے خدشات کا اظہار کیا تو اس نے اپنے ہونٹوں کے بائیں کونے میں زندگی کی تمام مسکراہٹیں بھرتے ہوئے اس کو شکی اور بے وقوف گردان کر اُس کے تمام شکوک رفع کر دیئے اور منصور اُس کی مسکراہٹوں میں ڈوب گیا۔

منصور نے دوستوں سے پیسے اُدھار لے کر تصویروں کی تین چار نمائشیں کیں۔ گورنمنٹ نے اُس کا کام اور اس کی صلاحیتیں دیکھ کر اُس کو فرانس جا کر اعلٰے تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظیفہ دیا۔ اُسی دن منصور نے سیمی سے کہا۔

"سیمی ——— مجھ سے شادی کرو گی؟"

سیمی خاموش تھی۔

"سیمی ——— پہلے مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی کہ تم سے شادی کے لئے کہہ سکوں۔ مجھے پتہ تھا کہ اپنے تمام جذبات اور احساسات کے باوجود تم میرے ساتھ خوش نہ رہ سکو گی۔ کیونکہ مجھ جیسے لوگوں کے پاس بعض اوقات اتنا پیسہ بھی نہیں ہوتا کہ دو وقت کا کھانا بھی کھا سکیں لیکن اب گورنمنٹ نے مجھے فرانس کے لئے سکالرشپ دیا ہے۔ وہاں سے لوٹ کر میں اس تاریک مکان میں نہیں رہوں گا۔ جہاں آکر تمہیں کھانسی شروع ہو جاتی ہے ...."

سیمی نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور گلے میں باہیں حائل کر دیں۔

"تم فکر نہ کرو منصور ——— میں تمہارے ساتھ گذارے ہوئے وقت کے سہارے زندہ رہوں گی۔ اور اس شام کو ہمیشہ اپنی آنکھوں میں بسا رکھوں گی، جب تم مجھے پہلی مرتبہ سیمنز میں ملے تھے اور والز کی دھن پر مجھے اپنے ساتھ ناچنے کے لئے کہا تھا ——— میں تمہاری منتظر رہوں گی ———"

پھر منصور آنسوؤں کے پردے میں چھپ گیا۔

کافی مدت تک فرانس میں سیمی کے خط باقاعدہ ملتے رہے۔ لیکن پھر خطوں میں وقفے کی خلیج اتنی بڑھ گئی کہ اس کا پاٹنا ناممکن ہو گیا اور پھر آخر کار منصور کی آنکھیں سیمی کے لکھے ہوئے حرف تک کو ترس گئیں ——— شاید سیمی اُس کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی ——— پھر بھی ڈاک کے جانے کے بعد وہ اپنے دل کو تسلّی دیا کرتا .... "کل اس کا خط ضرور آئے گا ——— وہ اپنے امتحانوں میں مصروف ہو گی .... اکرم ...... اس کی شادی ..... نہیں نہیں مجھے اُس کے متعلق ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔

جب وہ یورپ سے لوٹا تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا تخیل اپنی منزل ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود کہیں کھو گیا ہے۔

اُس نے جہاز سے اُتر کر لاؤنج میں کھڑے ہجوم کو دیکھا۔ جو اپنے عزیزوں کے استقبال کے لئے آیا ہوا تھا۔ اُس کی نگاہیں سیمی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئیں۔ لیکن سیمی نظر نہ آئی۔ وہ مایوس ہو کر ٹیکسی میں بیٹھنے لگا تھا کہ ایک ہاتھ نے اُس کے کندھے کو تھام لیا اُس نے اچھلتے دل سے مڑ کر دیکھا۔ اس کے چچا کھڑے مسکرا رہے تھے۔ اُنہیں ہوائی اڈے پر دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے اس کے باپ کی وفات کے بعد اپنے بھتیجے پر چچاؤں کے روایتی ظلم توڑے تھے۔ اور اس کو اس بہانے گھر سے نکال دیا تھا کہ صاحبزادہ مصوری کے شوق میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل نہیں کر سکا۔ وہ اچھی طرح حیران بھی نہ ہونے پایا تھا کہ چچا نے کہا۔

"میں نے تمہاری آمد کی خبر پڑھی تھی کہ ملک کا بہترین مصور منصور کاظم پیرس سے آرہا ہے — میں نے سوچا کہ اپنے منصور کے سوا اور کون ہو سکتا ہے — چلو گھر چلو تمہاری چچی اور — بیٹی عذرا تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔"

"میرا اس دنیا میں کوئی نہیں اور اب مجھے کسی گھر کی ضرورت نہیں۔"

اور وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر شہر کے بہترین ہوٹل میں آگیا۔

اس نے سیمی کو ٹیلیفون کیا۔ ٹیلیفون پر سیمی کے نوکر نے بتایا کہ دونوں باپ بیٹی گرمیاں گذارنے کے لئے خالہ کے ہاں گئے ہیں دو چار ہفتوں میں لوٹ آئیں گے۔ منصور نے ان کا ایڈریس پوچھا۔ نوکر نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اور منصور نے انتہائی مایوس ہو کر چونگا رکھ دیا۔

کچھ دنوں بعد منصور کو ایک انگریزی فرم میں بہت اچھی تنخواہ پر نوکری مل گئی۔

جب سیمی پہاڑ سے لوٹی تو منصور اُس کے ہاں گیا۔ اس نے اس کے خط نہ لکھنے اور ہوائی اڈے پر نہ آنے کے گلے شکوے کئے اور اس کو بتایا کہ یہ طویل عرصہ اُس کے لئے کتنا تکلیف دہ تھا۔ سیمی خاموش خلا میں گھورتی رہی۔ اُس نے اس سے خاموشی کی وجہ پوچھی، تو اُس نے منصور کے اصرار پر بتایا کہ وہ اس کے ساتھ گذارے ہوئے وقت کا زیادہ دیر تک سہارا نہ دے سکی۔

منصور جانتا تھا کہ سیمی اپنے چہرے کے ان مخصوص تاثرات کو چھپانے میں ناکام رہی ہے جو جھوٹ بولتے وقت ہمیشہ اس کے چہرے پر نمایاں ہو جایا کرتے تھے۔ اُس کے بہت زیادہ مجبور کرنے پر سیمی نے بتایا کہ اس کی امّی یہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس کی شادی خاندان سے باہر ہو اور خاندان میں مناسب لڑکا اکرم ہی تھا۔

سیمی نے آزاد خیال ہونے کے باوجود اپنی پیاری امّی کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ کہہ رہی تھی — "منصور! امّی جی کو دل کی بیماری بھی تو ہے۔ ممکن ہے خدانخواستہ .... اچھے ہوتی کیا ہُوا جو میں جسمانی طور پر تم سے چھن گئی ہوں۔ لیکن میرا دل و دماغ ..... میری روح ......"

منصور سیمی کے آنسوؤں میں ڈوبا صرف اُس کے ہونٹوں کو لرزتے دیکھ رہا تھا۔ اُسے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ جیسے اُس کے کانوں میں بھی آنسو اُمڈ آئے ہوں — جب سیمی نے اُس کو بتایا کہ اُس کی شادی اکرم کے ساتھ سردیوں کے آغاز میں ہو گی۔ تو اُس کو یوں محسوس ہُوا جیسے اس کی مونا لیزا لوور سے چُرالی گئی ہے۔ وہ خاموشی کے ساتھ وہاں سے چلا آیا — اُس سے کچھ بھی کہا نہ جا سکا۔

پھر وہ سیمی کی زندگی کی راہ گذاروں سے دُور ہوتا چلا گیا — بہت ہی ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے، وہ اپنی راہگذر پر سیدھا ہی سیدھا چلنے لگا — مڑ کر ماضی کو دیکھنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اپنے ذہن کی آگ بجھانے کے لئے اُس نے کینوسوں کو اپنے پسینے سے سینچا اور اپنے دل کی پیاس بجھانے کے لئے اُس نے سیمی کو بھول کر ہر لڑکی میں سیمی کی روح ڈھونڈنا چاہی لیکن سب کی سب اس کے برش اور رنگوں پر مرتی تھیں — وہ ان سب کو پینٹ کرتا رہا — ان میں سیمی کوئی نہ تھی اور پھر وہ سیمی کو بھول بھی چکا تھا۔ اپنے آپ کو بھی بھول گیا تھا — اور آج، اس وقت اس نوجوان اجنبی نے اس کی راہگذر پر چھائے ہوئے غبار کو صاف کر کے اُسے رُکنے پر مجبور کر دیا تھا — کم بخت کہیں کا — آخر اس اجنبی شخص کو کیا حق پہنچتا ہے کہ ....

سیمی سیمی جیسے کوئی اس کے ذہن پر سیاہ چاک رگڑ رہا تھا۔

چاک اس کے لاغر ہاتھوں سے نکل کر میز پر گر پڑا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنے ماتھے کو تھام لیا اور دوسرے ہاتھ سے بوتل کے

آخری گھونٹ گلاس میں انڈیلے اور اس کی یاس انگیز نگاہیں کونے کی طرف اُٹھ گئیں ــــــ خوش نما پھولوں کے پاس وہ اجنبی نوجوان اب بھی مسکرا رہا تھا لیکن اس کی مسکراہٹ بہت حد تک زخم خوردہ تھی۔ منصور کا جی بے حد چاہا کہ اس سے جا کر پوچھے کہ اس کو یہ سب کچھ کس طرح معلوم ہوا سو وہ کون ہے اور اُس کی طرف طنزیہ نگاہوں سے کیوں دیکھ رہا ہے۔ لیکن جانے کیوں وہ اُٹھ نہ سکا ــــــ اس کو اجنبی کے ہونٹ پھر لرزتے ہوئے معلوم ہوئے ــــــ تم نے زندگی بھر بڑی گھٹیا حرکتیں کی ہیں ــــــ تم یہ کیوں بھول گئے ہو کہ تم سیمی کے مُونی ہو اور سیمی نے تم سے کہا تھا کہ اُس کی روح تمہاری ہے ــــــ یہ بھول کر کہ تمہیں سیمی کی تلاش ہے تم نے کیوں اس کی روح کو ہر جسم میں ڈھونڈنا چاہا ــــــ شرابی ــــــ فراری ــــــ تم نے خود اپنے ساتھ بے وفائی کی ہے ــــــ تم اپنے فن کے ساتھ کیوں کر مخلص ہو سکتے ہو ــــــ شرابی ــــــ شرابی ــــــ"

منصور نے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔ ڈیئر۔

مُنی بولی "آں"

"اوشٹ اپ" منصور چلّا گیا۔

بار روم پر قبرستان ایسی خاموشی مسلط تھی۔ قریب قریب سب جا چکے تھے۔ صرف دو آدمی بیٹھے تھے۔

مسز کاؤس جی ٹاڈی والا نے ان کی کاروں کے ڈرائیوروں سے کہا۔ کہ وہ ان کو گھر لے جائیں اور خود کیش بکس میں پڑی رقم گننے لگی۔

مُنی سگریٹ پیتی ہوئی سوچ رہی تھی "کیا بکواس ہے ــــــ بھاڑ میں جائے مروت ــــــ ہونہہ بیوقوف بڑھا ــــــ میں یہاں کس لئے بیٹھی ہوں ــــــ شاید خان بہادر ابھی تک میرا منتظر ہوگا۔ اُس نے پرس کھول کر آئینہ نکالا اور لپ سٹک سے ہونٹ سُرخ کرنے لگی پھر اُس نے پرس بند کر کے تصویر کی طرف دیکھا "یہ کس کی تصویر بنا رہے ہو ــــــ میں تو ایسی نہیں ــــــ میرے گال پر تل بھی ہے ــــــ اچھا تو یہ اُس کی تصویر ہے جس کے نقوش مجھ سے ملتے جلتے ہیں ــــــ ابھی ابھی تو تم مجھ سے شادی کے لئے کہہ رہے تھے ــــــ تم بہت بڑے بور ہو اور اس سے بھی زیادہ فراڈ ــــــ میں تمہاری حرکت کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتی" "میں جا رہی ہوں"

اُس نے منصور کے جواب کا انتظار نہ کیا اور چلی گئی۔

منصور اُس کی موجودگی کو مکمل طور پر بھول چکا تھا۔ وہ اُس کے تصور کی حدوں میں نہیں تھی

مُنی نے اُس کے ماضی کی تخلیق کی تھی اور وہ اپنے آپ سے بھی بے خبر اپنے ماضی کی تکمیل کر رہا تھا۔ اس کو مُنی کے جانے کا ذرا بھی احساس نہ ہوا۔

چاک اُس کی چھوٹی انگلی بن کر تصویر پر آخری مرتبہ پھسل رہا تھا۔ رنگدار چاکوں نے اس تصویر میں کچھ عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی۔

آخر اُس کا چاک ہولے ہولے رُک گیا۔ اُس نے کاغذ سمیٹے اور اُس کی نگاہیں کونے میں پڑے ہوئے اُداس پھولوں کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ مسز کاؤس جی ٹاڈی والا کے پاس گیا۔ مسز کاؤس جی نے جمائی لیتے ہوئے کہا ــــــ

آپ کی گرل فرینڈ چلی گئی ہیں اور یہ چٹ چھوڑ گئی ہیں۔

اس نے چٹ پڑھنے کی بجائے کانپتی ہوئی آواز سے کونے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "وہ ــــــ وہ مجھے طنزیہ نگاہوں سے گھور رہا تھا"

"کون"

اس کونے میں پھولوں کے پاس وہ کون تھا ——— میں نے اس کو جاتے ہوئے نہیں دیکھا"

مسز کاوس جی ہاڈی والا کی بھنویں مرجھائے ہوئے پھولوں کی پتیوں کی مانند سکڑ گئیں۔

"معلوم ہوتا ہے آج آپ بہک گئے ہیں ——— مسٹر ——— ! اُس صوفے کی گدی فرنیچر کی دکان پر مرمت کے لئے گئی ہے ——— اور آج صبح سے وہاں کوئی نہیں بیٹھا"

پھر منصور کبھی کسی کلب میں نہ گیا۔ اور اس رات کے بعد تو اس کو زندگی بھر کسی نے کبھی کسی کے ساتھ نہ دیکھا، شراب کے ساتھ بھی نہیں ———"

دوست

ذیل کا افسانہ ایک مشہور افسانہ نگار کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے مگر وہ مصر ہیں کہ ان
کا نام اس افسانے پر نہ دیا جائے یقیناً اس میں کوئی مصلحت ہوگی جس کا ہمیں علم
نہیں۔ بہرحال ہم ان کے ارشاد کی تعمیل کر رہے ہیں۔ مُرتب

ریستوران کی فضا میں چمچوں، چھری کانٹوں اور پیالیوں، پلیٹوں کی جلترنگ راگنی سگرٹوں اور پائپوں کے سرمئی سے دھوئیں کی بے آواز زنجیروں سے اُلجھ رہی تھی اور گفتگو کے چھوٹتے ہوئے فواروں میں قہقہوں کے غبارے اُبھر اُبھر کر پھٹ رہے تھے۔

جب وہ آیا تھا تو ہال تقریباً خالی تھا مگر اب تو سوائے اس کی میز کے اور کہیں خالی کرسیاں دکھائی نہ دیتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اسی کونے میں بیٹھنا اور بھی اس جگہ کو پسند کرتا لیکن جمیل یہاں بیٹھنے کے سخت خلاف تھا۔ وہ سگرٹ ہونٹوں میں دبائے چائے کی پیالی سامنے رکھے ہال کے اس پار دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ایک برقعہ پوش عورت اور دو مرد اندر آئے اور ارشد کی میز کے پاس پہونچ کے رک گئے۔ پھر اشاروں ہی اشاروں میں انہوں نے کچھ طے کر کے اوپر کا رخ کر لیا۔

"پروفیسر!"

ارشد کی نگاہیں گیلری سے نیچے اتر آئیں۔

"کتنی دیر سے آئے ہو تم داور!"

"میرا پیشہ حرام خوری تھوڑا ہے کہ دو گھنٹے بکواس کی اور بس" داور نے میز پر پڑے سگرٹ کیس میں سے سگرٹ نکالتے ہوئے کہا۔ "کلرکی میں تو خون پسینہ ایک ہوتا ہے میاں۔"

"اور ہمیں جو گھر پر سر مارنا پڑتا ہے وہ کس حساب میں ہے؟" ارشد نے پوچھا۔

خاک مارتے ہوں گے" اس نے سگرٹ کا سرا سگرٹ کیس کی چکیلی سطح پر ٹھونکتے ہوئے کہا۔ "تم تو خود کہا کرتے ہو کہ بغیر تیاری کے پڑھاتا ہوں"

"مگر پھر بھی سوچنا تو پڑتا ہی ہے" ارشد نے عذر خواہی کے انداز میں کہا۔

"جسے پڑھنا دوبھر ہے وہ سوچے گا خاک" وہ ارشد کے سگرٹ سے سگرٹ سلگاتے ہوئے بولا "پڑھنا تو سوچنے سے کہیں آسان ہے اور پھر پڑھے بغیر سوچنا چہ معنی دارد؟"

"تم کیا جانو کلرک شاعر باتم ہندسے جوڑو یا تک بندی کرو۔ صبح بوڑھ گھنٹہ رتن ناتھ سرشار پر لیکچر دیا تو تین گھنٹے اس کے متعلق

سوچا۔ ادب تو اتھاہ ہے"

"اسی لئے تو تیاری نہیں کرتے تم۔ ادب اتھاہ ہے جو جی میں آیا بکتے رہے"

"میں تو بمشکل ایک پیریڈ میں ٹھان کو کسوٹ اور فسانۂ آزاد کا موازنہ ہی کر سکا۔" ارشد نے ایک لمبا کش لگا کر کہا۔

"یہ موازنے تو کئے کرائے مل جاتے ہیں۔ کوئی ادبی کارنامہ بھی کیا تم نے۔ دعا دو غیر ملکی پبلشروں کو جنہوں نے ریویو سمیت کتابوں کی فہرستیں چھاپنے کی رسم ڈال دی ہے۔"

"بڑے ہی کمینے ہو تم!" ارشد نے سگرٹ کے ٹکڑے کو ایش ٹرے میں زور سے دباتے ہوئے کہا۔

"کمینے تم ہو کہ میں؟" داور بولا "سامنے چائے رکھے بیٹھے ہو اور مجھے پوچھا تک نہیں۔"

"سگرٹ میں نے تمہارے منہ میں دیا تھا کیا؟ چائے بھی خود ہی پی لو۔"

"رات بڑا غضب ہو گیا یار" داور چائے بناتے ہوئے بولا۔

"کیا؟ کہیں تمہارے بغیر مشاعرہ ہو گیا؟"

"یہ اس شہر میں کیسے ہو سکتا ہے بزرگو" داور نے چائے کی چسکی بھرتے ہوئے کہا۔ "نظم ہوتے ہوتے رہ گئی۔ بس تین چار مصرعے کہے تھے کہ ٹک ٹک گرڑ گرڑ ہونے لگا۔ باہر احاطے میں حاجی جی کی بھینس دیوار کے ساتھ سر ٹھونکنے اور سینگ رگڑنے لگ گئی۔"

"اور شاعر کے ذہن سے نظم کیا غائب ہوئی گدھے کے سر سے سینگ غائب ہو گئے" ارشد نے چٹکی لی۔

"واقعی یار اس وقت میں گدھے سے بھی بدتر تھا۔ بڑا لاجواب خیال تھا لیکن بُرا ہو اس حاجی کا۔ پتہ نہیں یہ ٹکریں اور رگڑے کب سے جاری ہیں اینٹیں گھس گھس کر دیوار میں گڑھے پڑ چکے ہیں۔ مگر اسے تو دودھ سے غرض ہے جب تک آتا ہے بھینس ٹھیک ہے لوگ بہتیرا کہتے ہیں اسے ہسپتال لے جاؤ اس کے دماغ میں کیڑا ہے لیکن وہ دھیان ہی نہیں دیتا۔"

"بھئی آخر اُسے تمہارے دماغ کے کیڑے کا بھی تو علاج کرنا ہے ورنہ تم ساری رات شعر ہی کہتے رہو"

"بس یونہی لگا کرتے ہو ایسی عجیب بات سوجھی تھی کہ کبھی تمہارے وہم و گمان میں بھی نہ آئی ہوگی۔ سُنو

"یاد؟

ہاں یاد!

نہیں یاد نہیں،

اس کی بنیاد میں تو

اک تعلق کے تسلسل کی نفی مضمر ہے!

"کیوں؟ پلّے پڑا کچھ؟

"بس؟" ارشد نے مصنوعی بےتابی سے پوچھا۔ اسے بڑھاؤ بھئی۔ اس سے آگے ہو۔ ٹک ٹک گرڑ گرڑ۔ ٹک ٹک گرڑ گرڑ۔ خدا کی قسم دیکھو۔ تعلق کے تسلسل کی نفی تو اس طرح ثابت ہوتی ہے اور پھر کیا موتی اثر ہے ان الفاظ میں! بھئی سبحان اللہ"

داور حملہ کرنے کو ہی تھا کہ پاس والی میز پر جیسے پٹاخوں کی لڑی کو آگ لگ گئی۔ قہقہے تڑپ تڑپ کے پھیلے اور بھڑک بھڑک کے اڑے۔ سارا ریستوران یکبارگی خاموش ہو گیا اور سب کی نظریں ادھر اٹھ گئیں۔ دروازے کے قریب والی میزوں کے گرد اور اوپر گیلری میں بیٹھے ہوئے لوگ تو اٹھ اٹھ کے دیکھنے لگے۔ پھر جیسے ارد گرد کی خاموشی نے بڑھ کے پانچوں ہنسنے والوں کے ہونٹوں پر مہر لگا دی ان کی کھسیانی نگاہیں بیچ بیچ کے ادھر ادھر اٹھیں اور واپس ایک دوسرے کے چہروں پر آ ٹھہریں۔

"لاحول ولا۔ عجیب بدتمیزی ہے" داور نے مذمت کے لہجے میں کہا" لوگ ریستوران کو بھی اپنا ڈرائنگ روم سمجھتے ہیں"

"اس وقت جمیل ہوتا تو مزا آجاتا" ارشد بولا۔

"مزا کیا آتا" داور نے ناک چڑھا کر کہا" جو بدتمیزی ان پانچوں نے مل کے کی وہ اکیلا ہی کر لیتا"

"اس روز کی بات یاد ہے نا" ارشد کہنے لگا" ادھر سامنے بے ہنگم سی ہنسی ہنسنے والوں کو اس نے کس طرح لٹکا دیا تھا صرف دو بار اونچی آواز سے ہی ہی ہی ہی ہا ہا ہا کیا تھا اس نے۔"

"مگر ارشد تم بھولتے ہو کہ زیادہ لوگوں نے ہماری طرف ہی متعجب نظروں سے دیکھا تھا"

"یہ ٹھیک ہے" ارشد بولا" جمیل میں بازاری پن تو اچھا خاصا ہے نا"

"اچھا خاصا! مجھے تو اس میں سوائے بازاری پن کے اور کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا" داور نے بڑے حتمی انداز میں کہا" گلی میں سڑک پر پارک میں جہاں لڑکی دکھائی دی وہیں اس کے پیچھے ہو لیا۔ پیدل ہو تو پیدل تانگے میں ہو تو تانگے میں اور گندے فحش مذاق بے تحاشا پن کی بکواس کے ساتھ ساتھ لگتا چلا جاتا ہے میں حیران ہوں اسے ابھی تک جوتے کیوں نہیں لگے"

"اور بھئی داور اس کے یہ معاشقے جن کا ہر وقت ڈھنڈورا پیٹتا رہتا ہے۔ میرے خیال میں تو سراسر من گھڑت قصے ہیں۔ بالکل بکتا ہے اس کی باتوں پر جاؤ تو یہ سمجھو کہ کم از کم ایک سو لڑکیاں اس کی خاطر خود کشی کر چکی ہیں اور ایک سو اور sleeping pills کی شیشیاں خریدنے کی فکر میں ہیں"

"بھئی اتنا جھوٹ پیسے کے بل پر ہی بولا جا سکتا ہے" ارشد نے کہا۔

"پیسہ کتنا ہے اس کے پاس میوہ منڈی کے آڑھتی کا بیٹا ہی ہے نا" داور نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔" بے فکری البتہ ہے"

"اور بھئی داور اخلاق بھی تو اس کا منڈی ہی کا ہے۔ میں تو پانچ منٹ میں تنگ آجاتا ہوں اس سے"

"تو تمہارا خیال ہے مجھے بھلی لگتی ہے اس کی چخ چخ۔ لو آ ہی گیا" داور نے مسکراتے ہوئے دروازے کیطرف انگلی اٹھائی جمیل ابھی بیٹھا بھی نہ تھا کہ ارشد اٹھ کھڑا ہوا۔

"اٹھے پیر بھاگے بیر" جمیل بولا۔

"میں ذرا مارکیٹ تک ہو آؤں ایک چیز خریدنی ہے"

"خریدنی کیا ہے کہو دیکھنی ہے" داور نے مسکرا کر کہا۔" خریدنے میں تو پیسے خرچ ہوتے ہیں"

"جاؤ جاؤ دفع ہو نحوست ہٹاؤ" جمیل نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے اور آپ بیٹھتے ہوئے کہا" ایک یہ کوڑھ دوسرے تم۔ انتہا ہے۔

ارشد جا چکا تو داور کہنے لگا "بڑا ہی کنجوس ہے۔ کالج کا کام الگ، گھر پر ٹیوشن الگ، پھر یونیورسٹی، ریڈیو، اخبار، جانے کہاں کہاں اس نے ٹانگ اڑائی ہوئی ہے۔ پیسہ کہیں سے آئے نہیں چھوڑتا مگر کیا مجال جو سگرٹ چائے بھی کبھی بغیر پلا دے اور وہ دیکھو" اس نے دروازے کیطرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہاف سیٹ چائے کا بل کاؤنٹر پہ ادا کر رہا ہے بیرے کو دونی دیتے بھی اس کی جان نکلتی ہے"

"بالکل چیرٹ کرتا ہے سالا" جمیل بولا۔ پھر پاس سے گزرتے ہوئے بیرے سے مخاطب ہوا "بیرا، دیکھو ایک سیٹ چائے اچھا نپ اور آملیٹ اور ٹوسٹ۔ جلدی"

"اور لباس دیکھو نا اس کا" داور نے ابھی موضوع نہ بدلا تھا "میلی ٹائی اور ڈھیلا کالر اور سوٹ پر سلوٹیں ہی سلوٹیں۔ سوتے وقت بھی نہیں اتارتا شاید"

"بھئی اصل پروفیسر وہی ہوتا ہے۔ جسے اپنا ہوش نہ ہو" جمیل نے مسکرا کر کہا۔

"مطالعہ کرتے ہیں یا منافع کماتے ہیں؟" داور نے ہنس کر پوچھا "کل تم نہیں آئے تھے کہہ رہا تھا یار ایک آدمی کے ساتھ کھالوں کے بیوپار میں روپے آنہ حصہ رکھا ہے"

"اچھا؟" جمیل بول اٹھا "بھئی کیا کہنے! جواب نہیں اس کا بھی"

"بیرا چائے رکھ رہا تھا کہ گیلری میں کچھ تلخ کلامی ہوتی سنائی دی اور برقعہ پوش عورت کھٹ کھٹ زینہ اتر کر باہر چلی گئی۔

"گڑبڑ ہے" داور چانپ سے گوشت کاٹتے ہوئے بولا۔

"کیا ہو گا اب! اگر بڑا تو جا چکی بھی بڑی چو سرباز عورت ہے" جمیل نے تحسین کے لہجے میں آنکھ سے گیلری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو نا سالے چپے ہوئے پہر دن کیطرح اوندھے پڑے ہیں"

جمیل کی بات ٹھیک تھی۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھے اپنی اپنی کرسی کے بازو پر جھکے ہوئے چپ چاپ ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔

"عورت کو ڈھب پر لانا بھی بڑی مشکل بات ہے" داور بولا۔

"ٹھیک ہے" جمیل کہنے لگا "پر مرد کے سامنے عورت بیچاری چیز ہی کیا ہے یوں پھنستی ہے" اس نے چٹکی بجاتے ہوئے

"ہاں بھئی تم تو اس میدان کے شہسوار ہو" داور نے خراجِ تحسین ادا کیا۔

"ابھی کل ایک نئی مرغی پھنسائی" جمیل نے انکشاف کیا۔

"کون؟ کہاں؟" داور نے پوچھا۔

"اتنے تیز نہ ہو آج ہی دکھا دوں گا" جمیل کہنے لگا "پر یار ایک چھوکرے نے تو بس دل ہی موہ لیا ہے میرا۔ وہ ہمارے پیچھے شیخ صاحب نے مکان کیا ڈھایا مجھ پر غضب ڈھا دیا۔ حسن کا ایک نیا جھروکہ کھل گیا۔ لڑکی کوئی غیر معمولی نہیں پر بڑی ہی معصوم ہے یار۔ پہلی ہی بار عجیب نظارہ دیکھا وہ آئینہ سامنے رکھے بال سنوار رہی تھی۔ اچانک رک گئی کنگھی اس طرح اس کے ہاتھ میں تھی اس نے آئینے کو اٹھایا اور اسے ہولے ہولے چہرے کے قریب لاتی گئی قریب اور قریب اور پھر جھٹ اس نے اسے چوم لیا۔ ۔ ۔ ؟

" واہ وا! " داور بے اختیار کراٹھا وہ چائے کی پیالی منہ سے لگاتے لگاتے رہ گیا۔ " شعر کر دیا تم نے جمیل "

" شعر تو تم کہتے ہو داور میاں۔ ہم شعر کہتے نہیں کرتے ہیں "

" یہ شعر کرنا کیا محاورہ ہوا بھئی "

" یہ محاورہ نہیں شاعر صاحب " جمیل بولا " روزمرہ ہے آخر ہمیں بھی کچھ کچھ اس مقدمے کی کاروائی یاد ہے جو مولانا حالی نے شعرو شاعری پر کیا تھا "

" لاحول ولا تم تو حاجی جی کی بھینس سے بھی بڑھ گئے " داور چائے بناتے ہوئے بولا۔

" اس نے تمہاری بین نہیں سنی ہوگی نا " جمیل نے مسکرا کر کہا۔

" بین سنی کیا کہو بین بند کر دی۔ بڑا اچھوتا خیال سوجھا تھا داایک مصرعے ہی کہے تھے کہ اس نے دیوار سے ٹکریں مارنی شروع کر دیں۔ "

" تو تمہیں کیا تکلیف ہوئی ؟ تمہاری آورد شرما گئی؟ وہ تو بڑی ڈھیٹ ہوتی ہے یار "

" آورد نہیں آمد تھی میں متشاعر نہیں ہوں شاعر ہوں دیکھو تو کیا نکتہ حل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ مجھے محبوب کے سلسلے میں یاد کا لفظ استعمال کرنے پر اعتراض ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محب کا وقت محبوب کے تصور کے بغیر بھی کٹتا ہے مثالی تعلق میں محبوب کے خیال کو وقت پر حاوی ہونا چاہیئے وہ گویا محب کے شعور کی مستقل صفت بن جائے میرے نزدیک یاد محبت کی خامی کی دلیل ہے "

" حاجی جی کی بھینس بچی تھی بیچاری " جمیل نے میز پر زور زور سے پلیٹ کو رگڑتے ہوئے کہا۔

" یہ دو جملے میں نے اس لئے کہے کہ تم نظم سمجھ سکو " داور نے گویا فنی بلندی سے خطاب کیا۔

" نا صاحب میں نہیں سنتا تمہاری نظم "

جمیل اسی طرح زور زور سے پلیٹ کو میز پر رگڑتا رہا اور داور کہتا گیا۔

" یاد ؟ "

ہاں یاد !

نہیں یاد نہیں،

اس کی بنیاد میں تو

ایک تعلق کے تسلسل کی نفی مضمر ہے !

سمجھے ؟

" ہا ہا " جمیل ایک مصنوعی جھرجھری لے کر بولا " سانپ اور آسیب کا سامنا ہو کر کرا ہو گیا۔ چائے کی ایک اور پیالی بناؤ میرے لئے "

" آپ ہی بنالیجئے یار " کہہ کر داور چائے بنانے لگا پھر سامنے کلاک کو دیکھ کر بولا " مجھے مشاعرے پر جانا ہے بیس منٹ لیٹ

ہو گیا ہوں۔"

"میں تو بیٹھوں گا ابھی" جمیل کہنے لگا "اور سنو مرغی دیکھنی ہو تو پندرہ بیس منٹ میں باہر بس سٹاپ پر آجانا"

"پھر کسی دن دیکھ لیں گے یار کوئی اور مرغی" داور نے اٹھتے ہوئے کہا "تمہارے پاس کوئی کمی ہے پورے دل مرغیوں کی پوری پولٹری (poultry) کے انچارج ہو تم تو۔"

"جاؤ دفع ہو جاؤ" جمیل نے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "سیدھی بات کہو کہ میں بجلائے بغیر چین نہیں پڑتا"

"گھبراؤ نہیں تمہارا پروفیسر یار ابھی آجائے گا" داور جاتے ہوئے بولا "تمہاری خوب گاڑھی چھنے گی اس سے"

"ہماری تو تم سے گپ رہتی ہے بھئی وہ ہمارے کام کا نہیں" جمیل نے داور کی خالی کی ہوئی کرسی پر ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

داور جا چکا تو جمیل نے اوپر گیلری کی طرف دیکھا۔ بیٹھے ہوئے مہرے لباما چھوڑ کر نیچے آرہے تھے اس کی نظریں ان کے تعاقب میں ہال سے ہوتی ہوئی دروازے تک پہنچیں تو اس نے ارشد کو کھڑے دیکھا۔ پتہ نہیں اسے کیا ہوا اس نے چیخ کر کہا "ارشد!"

ہال میں پہلی گہما گہمی نہ رہی تھی پھر بھی کتنی حیران نگاہیں اس کی طرف اٹھیں۔ پھر وہ زور زور سے ہنسا جیسے اسے اپنی حرکت پر خوشی ہوئی ہو۔

"کیا ہوا تھا تمہیں؟ ارشد نے بیٹھتے ہوئے پوچھا "ڈر گئے کہ دماغ چل گیا؟"

"کچھ بھی نہیں یار۔ ایسے ہی ریستوران پر غصہ آگیا تھا" جمیل نے ہنستے ہنستے کہا۔

"کوئی کام کرو کہ تم میں انسانیت آئے" ارشد مسکراتے ہوئے بولا "باپ کی کمائی پر دند ناتے رہے تو باوجود گریجوایٹ ہونے کے ساری عمر گدھے رہو گے۔"

"تو انسان دنیا میں وہی ہیں کیا؟ تم اور داور؟" جمیل نے اپنے لہجے میں جھوٹی گرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" ارشد نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ وہ مجھے بھینس سمجھتا ہے اور تم مجھے گدھا کہہ رہے ہو۔ مگر انسان تم بھی نہیں تم پروفیسر ہو اور وہ شاعر۔"

دائیں طرف والی میز سے قہقہہ اٹھا۔ ارشد اور جمیل کو معلوم نہ تھا کہ ان کی آواز ان کی اپنی مملکت کی سرحد کو پار کر گئی تھی۔ دونوں ہنسنے لگے۔

"سگریٹ پیو یار" جمیل نے پیکٹ ارشد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"داور کہاں گیا ہے؟" ارشد نے پوچھا۔

"مشاعرے میں گیا ہے۔ بالکل بیخدہ ہے سالا" جمیل بولا "پاس بیٹھا ہو تو میرا تو دم گھٹنے لگتا ہے"

"مستقل بور (bore) کرتا ہے" ارشد کہنے لگا "مجھے تو تمہاری اوٹ پٹانگ باتیں اس کے شعروں سے زیادہ مزا دیتی ہیں۔"

"ویسے یار شعر کیسے کہتا ہے؟" جمیل نے قدرے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اسے کیا خبر شعر کیا ہوتا ہے" ارشد نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا "ہاں تک بندی کی اچھی خاصی مشق ہے اسے یوں وہ اپنے آپ کو لافانی شعراء میں شمار کرتا ہی ہے۔"

"ارشد یار یہ بھی بڑی مشکل بات ہے۔ کبھی کبھی بڑے بڑے عجیب خیال بے اختیار میرے دل میں آجاتے ہیں اور مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ شعر ہیں لیکن میں انہیں باہر نکالنے لگتا ہوں تو پارے کے قطروں کی طرح ادھر اُدھر بکھر جاتے ہیں۔ یہ دادا ر مالا بڑا چالاک ہے جانے کس طرح انہیں صحیح سلامت باہر لے آتا ہے"

"یہ ہے تو پھر تو تم طبعاً شاعر ہو" ارشد بولا "شعر کہنے کی کوشش کرو تم اصل شاعر ہو گے وادر تو رسمًا شاعر ہے"

"نہیں یار میں اس ادھیڑ بن میں لگ گیا تو میرے مرغی خانے کا کیا ہوگا میری دنیا اجڑ جائے گی اور کیا پتہ پھر کوئی خیال ہی میرے دل میں نہ آئے" جمیل کے لہجے میں ایک لمحے کے لئے سچ مچ کی بے چارگی آگئی تھی۔

"کتنے ہی پیسے بھی ملتے ہیں اسے غزلوں نظموں کے" جمیل پھر بولا۔

"پیسے کیا ملتے ہیں" ارشد کہنے لگا "پانچ چھ روپے مشاعرے والے دے دیتے ہوں گے دو ایک روپے اخبار رسالے والے ویسے تو وہ بیگار میں پکڑے جانے پر بھی خوش ہوتا ہے"

"اپنا اپنا نشہ ہے یار۔ پچھلی سردیوں میں میں نے جان بوجھ کر ایک چوزہ پالا تھا۔ مگر پھر اس پر چھری چلانے کو جی نہ چاہا اور میں نے اسے دانہ دنکا کھلا کے چھوڑ دیا"

"ٹھیک ہے وہ اقبال کہتا ہے نا

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

ارشد نے سند مہیا کی۔

دونوں ہنسنے لگے۔

"ارشد یار نشہ تو تمہارا ہے۔ مطالعہ"

"ہاں مطالعہ اور غور و فکر"

"غور و فکر سے مطلب پیسہ جوڑنے کی دھن" جمیل نے اسے چھیڑا "سنا ہے کوئی نیا کاروبار شروع کر رہے ہو"

"کاروبار تمہارے ہیں ہم کیا کاروبار کریں گے۔ زیادہ سے زیادہ کہیں سے سگرٹ چائے کے پیسے نکل آئیں گے اور کیا" ارشد نے عذر خواہی کے لہجے میں کہا۔

"لو نکالو پھر چائے کے پیسے۔ بیرا! بل لاؤ" جمیل ہنستے ہوئے بولا۔

"منافع کاروبار کے چلنے پر ہوتا ہے آغاز میں نہیں" ارشد نے ہنس کر دار خالی دیا۔

"بڑے ہی خسیس ہو تم دونوں" جمیل کہنے لگا "نوکریاں کرتے ہو ادھر ادھر بھی ہاتھ مارتے ہو اور بل چکاتا ہے یہ بیکار آدمی"

وہ کونے سے اٹھ کر دروازے کی طرف آئے ہال میں گفتگوؤں اور قہقہوں کی موجوں کا وہ زور نہ رہا تھا۔ کئی میزیں خالی ہو چکی تھیں اور غیر آباد جزیروں کی مانند دم بخود پڑی تھیں

وہ ریستوران سے باہر نکلے تو داور سامنے سے آتا دکھائی دیا
"میں نے سوچا آج تمہاری مُرغی دیکھ لوں" اس نے بلند آواز سے کہا۔
"مشاعرے میں ہُوٹ (HOOT) ہو گئے ہو گے نا" جمیل بولا۔
"ہُوٹ (HOOT) کرنے والا کوئی ہوتا بھی۔ ڈھائی آدمی تھے وہاں"
"اور شاعر کتنے تھے؟ ڈھائی سو؟" ارشد کہنے لگا "تمہاری باری آتے آتے سامعین کا انتقال ہو چکا اس لئے تم چلے آئے"
"میری غزل تو مردوں کو زندہ کر دیتی ہے"
"اسرافیل ہو ماشاءاللہ!" جمیل بس سٹاپ کیطرف دیکھتے ہوئے بولا۔
"کیا بات ہے؟ مرغی گم ہے؟ کڑک ہو گئی ہو گی یار" داور نے جمیل کے پہلو میں چٹکی لیتے ہوئے کہا۔
"پتہ نہیں یار کیا ہوا کہتی تھی چھوٹی بہن کو ساتھ لے کر ضرور آؤں گی دس روپے بھی لے لئے تھے اس نے مجھ سے" جمیل نے وضاحت کی۔
"اصل میں اس نے تمہیں تاریخ غلط دے دی" داور نے اسے پھر کچوکا دیا "آج کسی اور بس سٹاپ پر جاتا ہو گا اسے کیسی کیسی چوہر باز عورت ہوتی ہے اور کتنا کتنا بڑا مہرہ پٹ جاتا ہے!"
"آؤ یار وہاں کھڑے ہوتے ہیں" جمیل نے بس سٹاپ کیطرف اشارہ کرتے ہوئے ارشد کو کھینچا جو دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔
"مجھے ایک آدمی سے ملنا ہے پہلے بھی انتظار کر کے گیا ہوں کہتا تھا بائیسکل کنٹرول ریٹ پر لے دوں گا"
ارشد نے عذر پیش کیا۔
"وہ امپیریل سائیکل ورکس والا جس کا بھتیجا تمہارے پرچے میں فیل تھا وہی ہے نا!" جمیل نے ارشد کی ٹائی کو زور سے جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے ہی اسے تمہارا پتہ دیا تھا"
داور کھلکھلا کر ہنس پڑا اور ارشد کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا پھر جیسے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ "ہاں وہی بالکل وہی۔ کیا ہے اس میں؟"
"کچھ نہیں اس میں" جمیل بولا۔ "لڑکا نکل گیا بائیسکل رہ گئی۔ آؤ سینما چلیں"
"کونسی پکچر دکھاؤ گے" داور نے پوچھا
"جھانسی کی رانی" جمیل نے جواب دیا۔
"رش (RUSH) ہو گا اس پر یار اور ہم لیٹ ہو چکے ہیں" ارشد نے کہا۔
"یہ دیکھو" جمیل جیب سے تین ٹکٹ نکال کر بولا۔

اندھیرے اُجالے

مصنف:- کانسٹنٹین پاستووسکی
مترجمہ:- حیدر جعفری سید

وینس کی اس قدیم اور فرسودہ سرائے میں روشنائی نہ دام دے کر ملتی تھی نہ جان دے کے۔ روشنائی ——! ہم خواہ مخواہ روشنائی کیوں رکھیں؟ کیا غلط سلط جعلی بل لکھنے کے لیے۔

یہ درست ہے کہ جب ہینس کرسچین پہلے پہل اس شہر میں رہنے کے لیے آیا تھا۔ تو ایک دوات میں تھوڑی سی روشنائی تھی۔ پریوں کی کہانی، جو وہ لکھ رہا تھا۔ طویل ہوتی گئی۔ اور پانی ملاتے ملاتے روشنائی اتنی پھیکی پڑ گئی۔ کہ اُسے کہانی ادھوری چھوڑنی پڑی۔

اینڈرسن کو وینس سے انسیت سی ہو گئی تھی۔ وہ "وینس کو مرجھایا ہوا کنول" کہا کرتا تھا۔

اب سمندر پر خزاں کے بادل منڈلانے لگے تھے۔ نہر کا پرسکون پانی موجیں مارنے لگا تھا۔ سڑک کے ہر موڑ پر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے استقبال کے لیے منتظر ملتے تھے۔ لیکن جب دھوپ نکل آتی۔ تو دیواروں پر گلابی پتھر کا سا رنگ آ جاتا۔ اور کھڑکی سے وینس کا منظر، وینس کے قدیم فنکار "کنا لیتو" کا کوئی شہپارہ معلوم ہوتا تھا۔

یہ شہر حسین ہونے کے باوجود نہ جانے کیوں اداس اداس اور کچھ کھویا کھویا سا معلوم ہوتا۔ اور اب تو اس کی رخصت کا وقت بھی آ گیا تھا۔ اُسے اب کسی دوسرے شہر کے لیے روانہ ہونا تھا۔

جب اس نے سرائے کے ملازم کو ویرونا جانے والی گاڑی کا ٹکٹ لانے کے لیے بھیجا تو اُسے کوئی خاص افسوس نہیں ہوا۔ نائٹ کوچ جب وینس سے روانہ ہوئی۔ تو بوندیں پڑ رہی تھیں۔ اور رات ہو چلی تھی۔ کوچوان بڑبڑا رہا تھا۔ کہ رات کے وقت وینس سے ویرونا تک کوچ بھیجنے کا خیال صرف شیطان ہی کر سکتا ہے۔

مسافر اس کی بڑبڑاہٹ سے قطعاً متأثر نہیں ہوئے۔ کوچوان نے غصّے میں زور سے تھوکا اور اعلان کیا۔ کہ اب اور موم بتیاں نہیں، بلکہ صرف وہی چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ جو شمع دان میں جل رہا ہے۔ اس پر بھی کوئی متوجہ نہیں ہوا۔ اور کوچوان نے بلند آواز سے اُن لوگوں پر آوازے کسے۔ جو ویرونا جیسی بدنام اور بیکار جگہ کا سفر کرتے ہیں۔ اُس کے خیال میں ویرونا ایسی جگہ تھی۔ جدھر شریف آدمی ایک نگاہ ڈالنا بھی پسند نہیں کرتے۔

ظاہر ہے کہ مسافر ویرونا کے بارے میں کوچوان کی اس ذلیل رائے سے متفق نہیں تھے۔ لیکن انہوں نے کوئی بحث شروع نہیں کی۔ کوچ میں تین مسافر تھے۔ اینڈرسن...... ایک ادھیڑ عمر کا اُداس پادری اور سیاہ لبادے میں ملبوس ایک خاتون ــ اینڈرسن کو وہ خاتون کبھی بوڑھی معلوم ہوتی کبھی جوان، کبھی حسین، کبھی بدصورت، دراصل یہ سب کچھ شمع کی جھلملاتی روشنی پر منحصر تھا۔ اینڈرسن نے مشورہ دیا۔ "ہم یہ شمع بجھا کیوں نہ دیں۔ ابھی تو اس کی چنداں ضرورت نہیں ممکن ہے بعد میں....."

"کوئی اطالوی اتنا دور اندیش نہیں ہو سکتا" پادری صاحب بولے۔

"لیکن کیوں؟"

"اطالوی کبھی مستقبل کی فکر نہیں کرتا۔ وُہ اس وقت ہوش میں آتا ہے۔ جب چڑیاں کھیت چُگ چکی ہوتی ہیں"

اینڈرسن نے دھیرے سے کہا "معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضور اس قوم سے تعلق نہیں رکھتے؟"

"میں آسٹرین ہوں"! پادری کے اس خشک جواب پر بات ختم ہوگئی۔

اینڈرسن نے شمع گل کردی۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر وُہ خاتون بولیں "اٹلی کے اس حصہ میں بغیر روشنی کے ہی سفر کرنا دانش مندی ہے"

پھر بھی کوچ کے پہیئے چلاّ رہے ہیں۔ کہ کوئی جا رہا ہے ——— میرا خیال ہے۔ خواتین کو رات کے وقت تنہا سفر نہیں کرنا چاہیے" پادری صاحب بولے۔

وہ خاتون بڑی بے تکلفی سے ہنسیں۔ اور اینڈرسن کی طرف اشارہ کرکے جو اُن کے بغل میں بیٹھا ہوا تھا۔ فرمانے لگیں۔

"میں تنہا نہیں ہوں"

اینڈرسن نے اپنی ٹوپی اُتار کر خاتون کا شکریہ ادا کیا۔ شمع بُجھ گئی تو آوازیں اور خوشبوئیں نمایاں ہوگئیں۔ جیسے اپنے رقیب کے چلے جانے سے اُن کی ہمت بڑھ گئی ہو

گھوڑوں کی ٹاپ اور بگھی پر پہیوں کی آواز موسم بہار کی شکوہ آمیزی ہوا کی سرسراہٹ، کوچ کی چھت پر بُوندوں کی ٹپا ٹپ پہلے سے زیادہ واضح ہوگئی۔ بھیگی ہوئی گھاس اور دلدلی زمین کی سوندھی سوندھی مہک اور تیز ہوگئی۔

اینڈرسن نے کہا بڑی عجیب بات ہے۔ مَیں تو اٹلی میں جنگلی نارنگیوں کی خوشبو کا متوقع تھا۔ لیکن یہ تو میرے اپنے ملک کی ہوا معلوم ہوتی ہے"۔

خاتون بولیں "ابھی تو ہم ایک پہاڑی پر ہیں۔ کچھ دیر بعد ہوا اور گرم ہو جائے گی"۔

گھوڑے اب مدہم رفتار سے چل رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ڈھال شروع ہوگیا ہے۔ لیکن تاریکی کم نہیں ہوئی۔ سڑک کے دونوں طرف ایلم کے پرانے درخت ایستادہ تھے۔ جن کی بڑی بڑی پھیلی ہوئی شاخیں تاریکی میں ملبوس معلوم ہوتی تھیں۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے پتیاں بُوندوں سے سرگوشیاں کر رہی ہوں

اینڈرسن نے کوچ کا دروازہ کھولا۔ ایلم کی ٹہنیاں اندر گھس آئیں۔ اُس نے مُٹھی بھر پتیاں نوچ لیں۔

بہت سے زندہ دل لوگوں کی طرح وُہ بھی اپنے سفر کی یادگار قائم رکھنے کے لیے چھوٹی موٹی اشیا جمع کرنے کا شائق تھا۔ اُس کے خیال میں ان چھوٹی موٹی چیزوں میں بڑی ساحرانہ قوت ہوتی ہے۔ ان سے ماضی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اُس زمانے کے جذبات تازہ ہو جاتے ہیں۔

رات کافی گذر چکی تھی۔ اینڈرسن نے ایک دوست کی طرح رات کا استقبال کیا۔ تاریکی روشنی سے زیادہ خوشگوار ہوتی ہے تاریکی میں اُسے ہر قسم کے مسائل پر غور کرنے کا موقع ملتا۔ اور جب وُہ ان مسائل سے اُکتا جاتا۔ تو پھر وُہ کہانیاں تخلیق کرتا۔ جن کا ہیرو وُہ خود ہوتا۔

ان کہانیوں میں وہ اپنے آپ کو ایک حسین، حوصلہ مند نوجوان تصور کرتا تھا۔ اور اُسے کبھی اُن ساحرانہ الفاظ کی کمی محسوس ہوتی جنہیں نقاد "شاعری کا جوہر" کہتے ہیں۔ ویسے اینڈرسن بدصورت، سخی اور شرمیلا تھا۔ اور وہ خود بھی جانتا تھا۔ کہ وہ کیا ہے؟

اُس کے ہاتھ پاؤں، لکڑی اور رسی کے اُس ڈھانچے کی طرح لگتے تھے۔ جو اس کے وطن ڈنمارک کے بچوں کو بہت پسند تھا۔

اور ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اُسے کوئی امید نہ تھی۔ کہ کوئی عورت اُسے پسند کرے گی۔ اس مایوسی کے باوجود جب عورتیں اُس کے قریب سے اس طرح گذر جاتیں۔ جیسے وہ بجلی کا کھمبا ہو۔ تو اُسے بڑا دُکھ ہوتا۔

اُس کی آنکھ لگ گئی۔

اور جب وہ بیدار ہوا، تو سب سے پہلے اُس کی نظر ایک سنہری مائل ستارے پر پڑی۔ جو اُفق پر نیچے کی طرف جھک رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ رات کافی گذر چکی ہے۔

کوچ رُکی ہوئی تھی۔ باہر سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔ کوچوان لڑکیوں سے جھک جھک کر رہا تھا جنہوں نے کوچ رُکوائی تھی۔

اُن کی آواز اتنی دلکش تھی کہ اُسے ایک پرانے اوپرا کے گیت یاد آ گئے۔

کوچوان اس بات پر مُصر تھا۔ کہ وہ لڑکیاں جو کرائے کے پیسے طے کر رہی ہیں کم ہیں۔ اور لڑکیاں کہہ رہی تھیں۔ کہ اُن کے پاس اور پیسے ہیں ہی نہیں۔

اینڈرسن بیچ میں بول پڑا۔ "چلو بھئی چلو! باقی پیسے مَیں دے دُوں گا۔ بلکہ اگر تم ذرا مہذب اور باتمیز بن جاؤ تو انہیں اور زیادہ پیسے دے دُوں گا۔"

کوچوان بڑبڑایا "تو پھر آ جاؤ میری پیشو! اور میڈونا کا شکر ادا کرو جس نے اس غیر ملکی شہزادے کو بھیج دیا۔ جو اپنی دولت لُٹاتا پھرتا ہے۔ مگر تم اِترانا مت؛ دراصل وہ یہ نہیں چاہتا۔ کہ کوچ رُکی رہے۔"

پادری صاحب اُکتا گئے۔ "یا خدا!"

خاتون بولیں "لڑکیو — میرے قریب بیٹھ جاؤ۔ سردی لگ جائے گی۔"

لڑکیوں کی پوٹلیوں میں سے بکری کے دُودھ کی پنیر اور پودینہ کی خوشبو آ رہی تھی۔

تاریکی کے باوجود اینڈرسن کی نظر لڑکیوں کے آویزوں کے سستے شیشے کی چمک پر پڑی۔

کوچ پھر چلنے لگی۔ بجری پر پہیوں کی آواز پھر سُنائی دینے لگی۔ لڑکیاں سرگوشیاں کرنے لگیں۔

خاتون نے پُوچھا "یہ لڑکیاں آپ سے متعارف ہونا چاہتی ہیں"۔ اینڈرسن کو اندھیرے میں یہ احساس ہوا کہ وہ مُسکرا رہی ہے "آپ کسی مُلک کے شہزادے ہیں یا دورہ کرنے والے فارسٹ رینجر؟"

اینڈرسن نے بغیر کسی تکلف کے جواب دیا۔ "مَیں ایک پیغامبر ہوں۔ مَیں مستقبل پر بھی نظر رکھتا ہوں۔ اور اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا ہوں۔ لیکن محترم خاتون! مَیں ڈھونگ رچانے والا نہیں ہوں۔ میں صرف شاعر ہوں اور شاید اس ملک کا معمولی سا شہزادہ بھی ہوں جو کبھی بیلے کا دولہا تھا۔

ایک لڑکی نے تعجب سے پُوچھا "کیا آپ اس اندھیرے میں بھی دیکھ سکتے ہیں؟"

"ہاں! کیوں نہیں! مثلاً مَیں تم کو اتنے واضح طور سے دیکھ رہا ہوں۔ کہ میرا دل تمہاری خوبصورتی کے اعتراف سے معمور ہے۔"

یہ کہتے کہتے اُس کا چہرہ سرد ہونے لگا۔ یہ اس بات کی علامت تھی۔ کہ اُس پر وہ مخصوص کیفیت طاری ہو رہی ہے۔ جب پریوں کی کہانیاں اُس کے ذہن میں جنم لیتی ہیں۔ اس کیفیت کی علامتیں تھیں۔ ایک اُلجھن، ایک نامعلوم چشمے سے الفاظ کا پُرشور اُبال، قدرتِ شاعرانہ اظہارِ بیان کی قدرت، اور انسانی قلوب پر قدرت ــــ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی پُرانے صندوق کا ڈھکنا اچانک کھل گیا ہو۔ اور اس صندوق میں اچھوتے خیالات اور خوابیدہ تخیلات بکھرے پڑے ہوں جس میں دھرتی کا مکمل حُسن، اس کے پھول، اس کی آوازیں، معطر ہوائیں، دل کو گُدگدانے والی سمندر کی پہنائیاں، جنگلوں کی سرگوشیاں، محبت کی آزمائشیں اور بچوں کی معصوم باتیں چھپا چھپا کر رکھی گئی ہوں۔

اینڈرسن ان کیفیت کا نام نہیں جانتا تھا۔ بعض لوگ اسے الہام کہتے ہیں۔ بعض وجدانی کیفیت اور ممکن ہے کہ کچھ لوگ اسے حاضر دماغی کی صلاحیت کہیں۔

اینڈرسن نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا " اور جب میری آنکھ کھلی۔ تو تمہاری آوازیں سُنائی دیں میرے خیال میں نہیں جانتے اور اپنی بہنوں کی طرح تم سے محبت کرنے کے لیئے یہ کافی تھا۔ ہاں میں تمہیں اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں۔ اب تم ــــ تُو جس کے بال گھنے اور ابریشمی ہیں۔ تم ہر وقت ہنستی رہتی ہو۔ اور تمہیں ہر جاندار سے اتنی محبت ہے۔ کہ جب تم باغ میں کام کرتی ہو۔ تو چڑیاں تمہارے کاندھے پر آکر بیٹھ جاتی ہیں "

ایک لڑکی نے آہستہ سے کہا " یہ تمہارا ذکر ہے نکولینا "

اینڈرسن اسی طرح مدہم آواز میں کہتا رہا " نکولینا! تمہارا دل بڑا نازک اور دردمند ہے۔ اگر خدانخواستہ تمہارے محبوب کو کچھ ہو جائے۔ تو تم اس کے پاس پہنچنے کے لیئے برف پوش پہاڑیوں اور بے آب و گیاہ صحراؤں کا سفر کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرو گی ٹھیک ہے نا؟

نکولینا نے آہستہ سے کہا " ہاں اس میں کیا شک ہے؟ آپ دُرست فرما رہے ہیں "

اینڈرسن نے پُوچھا " تم لوگوں کے نام کیا ہیں؟

ان میں سے ایک نے جلدی سے جواب دیا " نکولینا، ماریا، اور آنا "

" اچھا تو ماریا! میں تمہارے حُسن کے بارے میں کچھ کہنے سے ہچکچا رہا ہوں۔ اس لیئے کہ مجھے اطالوی زبان بہت کم آتی ہے۔ لیکن جوانی میں میں نے شاعری کے دیوتا کے سامنے قسم کھائی تھی کہ میں حُسن کی تعریف ضرور کروں گا۔ چاہے مجھے کہیں بھی نظر آئے "

پادری صاحب بڑبڑائے " اے خدا! ہم لوگوں پر رحم کر۔ ان کا دماغ چل گیا ہے۔ غالباً کسی پاگل کتے نے کاٹ لیا ہو گا "

اینڈرسن نے اپنی بات جاری رکھی " کچھ عورتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جن کا حُسن بلائے جان ہوتا ہے۔ وہ احساسات کی دُنیا میں بھی ہیں ایسی تپش کے آثار اُن کے چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں۔ جیسے اندر شعلے بھڑک رہے ہوں۔ ماریا! تم بھی ان ہی عورتوں میں سے ہو۔ ایسی عورتوں کی قسمت میں عموماً یا تو مسرت ہی مسرت ہوتی ہے۔ یا پھر غم ہی غم "

تھامسن نے پُوچھا " جناب! آپ کبھی اس قسم کی عورت سے ملتے ہیں؟ "

" ہاں ہاں! اس گاڑی میں بھی بیٹھا ہوں۔ میرا مطلب صرف ماریا ہی سے نہیں۔ بلکہ آپ سے بھی ہے "

خاتون نے قدرے رُندھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔" اگر آپ یہ باتیں رات کے اس طویل سفر کی بے کیفی کو کم کرنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ تو یہ اس بھولی بھالی لڑکی کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی؟" پھر وُہ آہستہ سے بولیں " اور میرے ساتھ بھی!"

اینڈرسن بولا "محترم خاتون! میں اپنی زندگی میں اس سے زیادہ سنجیدہ کبھی نہیں ہُوا!"

"لیکن میری زندگی کیسے کٹے گی؟ مسرت میں یا رنج میں؟" ماریا نے پُوچھا۔

"تم زندگی سے جو کچھ مانگ رہی ہو۔ وُہ گاؤں کی ایک بھولی بھالی لڑکی کے لئے بہت زیادہ ہے۔ تمہیں آسانی سے خُوشی نہیں، ملے گی۔ ہاں! تمہاری ملاقات ایک ایسے انسان سے ہوگی۔ جو تمہاری تمام آرزوؤں کو پُورا کر دے گا۔ یقیناً وُہ آدمی قابلِ احترام ہوگا شاید مصوّر ہو یا شاعر! یا تمہارے وطن کی آزادی کا مجاہد! یہ بھی مُمکن ہے۔ کہ وہ معمولی چرواہا ہو یا ملّاح ہو۔ لیکن بہرحال اُس کے سینے میں دردِ مندِ دل ہوگا"

ماریا آہستہ سے بولی "جناب مَیں آپ کو دیکھ نہیں سکتی۔ اس لیے مُجھے یہ پوچھتے ہُوئے شرم نہیں معلوم ہوتی۔ کہ مجھے اس وقت بھی اگر کسی ایسے ہی آدمی سے محبت ہو تو کیا ہوگا؟ میں نے اسے چند ہی بار دیکھا ہے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلُوم کہ وُہ اب کہاں ہے؟ اُس کے لہجے میں خود اعتمادی کی جھلک نمایاں تھی۔

اینڈرسن نے جواب دیا" اُسے تلاش کرو۔ پتہ لگاؤ۔ تو تمہیں یقین آ جائے گا۔ کہ وُہ تم سے محبت کرتا ہے"۔

اناؔ بیچ ہی میں بول پڑی" ماریا! وہی نوجوان مصوّر نا جو ویروؔنا کا رہنے والا ہے"۔

"چپ رہ" ماریا نے اُسے جھڑک دیا۔

وُہ خاتون بولیں" ویروؔنا کوئی ایسی بڑی جگہ نہیں ہے۔ وہاں تم اُسے آسانی سے تلاش کر سکتی ہو۔ میرا نام یاد کر لو۔ ایلیناؔ گوئی چیولی۔ مَیں ویروؔنا ہی میں رہتی ہوں۔ کسی سے بھی میرا پتہ پُوچھ لینا۔ ماریا! تم ویرونا ضرور آنا۔ اور اُس وقت تک میرے ساتھ رہنا جب تک وُہ مصوّر نہ مل جائے جس کے متعلق ان حضرت نے ابھی پیشینگوئی کی ہے"۔

ماریا نے اندھیرے میں ٹٹول کے ایلیناؔ گوئی چیولی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ پھر اُن کی سرد اُنگلیوں کو اپنے گرم گرم رخساروں سے لگا لیا۔

ہر شخص خاموش تھا۔ اینڈرسن نے دیکھا کہ وُہ سبزی مائل ستارہ اور نیچے چلا گیا ہے۔ آدھی رات گذر چکی تھی۔

بالآخر اناؔ سے نہ رہا گیا۔ اور اُس نے پُوچھا" کیا آپ مجھے کچھ نہ بتائیں گے؟"

اینڈرسن نے بڑے اعتماد سے جواب دیا" تمہارے بہت سے بچے ہوں گے۔ اُن کے دُودھ کے گلاسوں کی پوری ایک قطار ہوگی۔ اُن کے نہلانے دُھلانے اور اُن کے بال سنوارنے میں تمہارا کافی وقت صرف ہوگا۔ ہاں تمہارا شوہر تمہارا ہاتھ بٹائے گا...."

اناؔ چیخ پڑی" وُہ پیترو! ہرگز نہیں! وُہ بھلا کیا کرے گا۔ اجڈ اور نکما کہیں کا"۔

......" اور تم اپنے وقت کا کافی حصہ ان چمکتی ہُوئی آنکھوں والے ننھّے مُنّے بچوّں اور بچیوں کو پیار کرنے میں صرف کرو گی"

پادری صاحب بڑبڑائے" بھلا کون سوچ سکتا ہے! کہ عزّت مآب کے مُلک میں ایسی پاگل پن کی باتیں بھی ہوتی ہیں"۔ لیکن کوئی بھی اُن کی جانب متوجہ نہیں ہُوا۔

لڑکیاں کھسر پھسر کرنے لگیں۔ اور کبھی کبھی اُن کے ہنسنے کی آواز بھی آجاتی تھی۔ کچھ دیر بعد ماریا بولی "جناب! اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ہم لوگ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ کہ آپ کون ہیں؟ اندھیرے ہیں تو کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔"

اینڈرسن نے کہا "میں ایک جہاں گرد، نوعمر شاعر ہُوں۔ میرے گھنے گھونگھریالے بال ہیں۔ میرا چہرہ دھوپ سے سنولا گیا ہے۔ میری نیلی آنکھیں ہر وقت مُسکراتی رہتی ہیں۔ کیونکہ مجھے دُنیا میں کسی چیز کا غم نہیں ہے۔ محبت کا بھی نہیں۔ کیونکہ ابھی تک کسی نے مجھ سے محبت نہیں کی۔ میرا کام صرف یہ ہے۔ کہ اپنے اردگرد کے لوگوں کے لیے چھوٹے چھوٹے تحفوں کی تخلیق کرتا رہوں۔ یا اُن کے چھوٹے موٹے کام کر دیا کروں ــــــ جن سے اُن کو خوشی ہو۔"

"مثلاً" ایلینا نے پُوچھا۔

"مثلاً یہ کہ پچھلی گرمیوں میں مَیں اپنے ایک رفیق کے ہاں مقیم تھا۔ جو جٹ لینڈ میں جنگلات کے افسر ہیں۔ ایک دن ٹہلتے ٹہلتے میں میدان میں پہنچ گیا۔ جہاں ان گنت کھمبیاں تھیں۔ کچھ دیر بعد میں وہاں پھر گیا۔ اور ہر کھمبی کے نیچے مَیں نے چمکدار کاغذوں میں ملفوف مٹھائیاں، موم کے بنے ہوئے پھُولوں کے گلدستے، انگوٹھیاں اور خوبصورت ربن چھپا دیئے۔ دوسرے دن صُبح کو مَیں اپنے دوست کی لڑکی کے ہمراہ وہاں گیا۔ سات سالہ بچّی کو کھمبیوں کے نیچے جو عجیب و غریب چیزیں ملیں۔ تو وُہ خوشی سے پھُولی نہ سمائی۔ کاش! اس وقت آپ اُس کی آنکھوں کی چمک دیکھ سکتیں! صرف کھجُور وہاں نہیں تھی۔ شاید کوئی پرندہ اُٹھا لے گیا ہو۔ مَیں نے اُس بچّی سے کہا کہ یہ تحفے تمہارے لیئے پالشتیے رکھ گئے ہیں۔"

پادری صاحب نے احتجاج کیا۔ "ایک معصُوم بچّی کو دھوکا دیا، گناہِ کبیرہ ہے۔"

"نہیں! مَیں نے اُسے دھوکا نہیں دیا۔ وُہ بچّی تمام عمر اُس دن کو یاد رکھے گی۔ اور مَیں آپ کو یقین دلا سکتا ہوں۔ کہ ان لوگوں کی طرح وُہ کبھی ظالم نہ ہو گی۔ جنہوں نے پریوں کی کہانیوں میں حصّہ نہیں لیا۔ اور قبلہ و کعبہ! اگر آپ اجازت دیں۔ تو مَیں یہ بھی عرض کروں کہ مَیں بلاوجہ فہمائش کرنے کا عادی نہیں ہُوں۔"

کوچ رُک گئی۔ لڑکیاں ساکت و صامت بیٹھی رہیں۔ جیسے وُہ سحر زدہ ہوں۔ ایلینا بھی خاموش تھی۔ اُس کا سر جھکا ہُوا تھا۔ کوچوان چلّایا "بیٹیو! جاگو! ہم لوگ منزل پر پہنچ گئے ہیں۔"

لڑکیاں پھر سرگوشیاں کرنے لگیں۔ پھر کچھ فیصلہ کر کے کھڑی ہو گئیں۔ اچانک تاریکی میں دو مضبُوط پتلی پتلی باہوں نے اینڈرسن کی گردن کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ اور اُس کے لبوں سے دو گرم گرم ہونٹ پیوست ہو گئے۔ ہلکی سی آواز آئی "شکریہ" اینڈرسن نے پہچان لیا۔ یہ ماریا تھی۔ نکولینا نے بھی اُس کا شکریہ ادا کیا۔ بہت گرم جوشی سے اُسے پیار کیا۔ پھر اینڈرسن کو اپنے رُخسار پر زُلفوں کی ایک لٹ کی سرسراہٹ محسُوس ہُوئی۔ یہ ایلینا تھی۔ اُس نے بھی اُسے خوب پیار کیا۔

لڑکیاں کوچ سے اُتر گئیں۔ کوچ شہر کی کسی پکّی سڑک پر چلتی ہُوئی آگے بڑھ گئی۔

اینڈرسن نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ لیکن اُفق پر چھائے ہُوئے صُبح کے نیلگوں دھندلکے میں درختوں کی سیاہ چوٹیوں کے سوا کچھ نہ دکھائی دیا۔

وینس پہنچ کر اُسے بڑی حیرت ہُوئی۔ ہر عمارت حُسن اور شان و شوکت میں ایک دوسری پر سبقت لے جانے کی کوشش

کر رہی تھی۔ ممکن تھا۔ اُسے پُر خوشی ہوتی۔ لیکن اُس کا دل بے چین ہو رہا تھا۔

اُسی شام کو اینڈرسن نے ایلینا گوئی چیولی کے مکان پر دستک دی۔ جو سڑک پر واقع تھا۔ مکان سے کچھ آگے ایک گڑھی تھی۔ ایلینا نے خود ہی دروازہ کھولا۔ اُس کا چھریرا بدن سبز مخمل میں ملبوس تھا۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ اُس کے لباس کا عکس اُس کی آنکھوں میں جھلک رہا ہے۔ جو والکیریوں کی آنکھوں سے زیادہ نیلی تھیں۔ اور جن میں بلا کا حُسن تھا۔

ایلینا نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر اینڈرسن کے ہاتھوں کو پکڑ لیا۔ اور اپنی نازک مگر سرد انگلیوں سے اُس کے مضبوط ہاتھ دباتے ہوئے، اُسے ایک چھوٹے سے ہال میں لے گئی۔ اُس نے شرما کر مُسکراتے ہوئے بڑی سادگی سے کہا: "بہت اچھا ہُوا کہ آپ تشریف لے آئے۔ میں اتنی ہی دیر میں آپ کی کمی محسوس کرنے لگی تھی۔"

اینڈرسن کا چہرہ زرد ہو گیا۔ وُہ تمام دن بے چینی سے ایلینا کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ وُہ جانتا تھا۔ کہ آدمی کسی عورت سے ایک لفظ کہے بغیر ہی اُس کی ایک ایک چیز سے محبت کر سکتا ہے۔ ایسی محبت جس میں درد ہو۔ کسک ہو، لیکن اگر ایسی محبت کی آگ اُس کے دل میں سُلگنے لگی۔ تو کیا وُہ اسے برداشت کر سکے گا۔ ممکن ہے کہ اس محبت میں ایسا درد اور اتنا والہانہ پن، آنسو اور مسکراہٹیں پُھول اور کانٹے ہوں۔ کہ وُہ اُس کی رنگا رنگی اور کرشمہ سازیوں کا متحمل نہ ہو سکے۔ اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اگر وُہ محبت کرنے لگے۔ تو پھر پریوں کی کہانیوں کے وُہ حسین جلوس جو اُس کے ذہن میں گزرتے رہتے ہیں۔ نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں اور پھر کبھی نظر نہ آئیں۔ پھر اس کے پاس بھلا کیا رہ جائے گا؟"

اور اُسے یہ بھی خیال تھا کہ اس قسم کی محبت یک طرفہ ہوگی۔ اُس کی زندگی میں جانے کتنی بار ایسا ہو چکا ہے! تلون مزاجی، ایلینا جیسی عورتوں کی فطرت میں داخل ہوتی ہے۔ ایک دن آئے گا۔ جب اُسے اُس کی بدصورتی کا احساس ہو گا۔ وُہ خود بھی خود کو بدصورت سمجھتا تھا۔ اکثر اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی اُسے حقارت سے گھُور رہا ہے۔ اس وقت اُس کے پاؤں من من بھر کے ہو جاتے اور وُہ لڑکھڑانے لگتا۔ جیسے گر کر زمین میں دھنس جانا چاہتا ہو۔ اُس نے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔ کہ محبت صرف تخیل میں شاعری کے نُور کے دائرے میں ہمیشہ تر و تازہ، شاداب اور جوان رہ سکتی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے۔ کہ وُہ اپنی حقیقی زندگی سے زیادہ اپنی تحریروں میں محبت کی رُوح پھُونک سکتا تھا۔

اسی لیے وُہ اچھی طرح یہ طے کر لینے کے بعد ایلینا سے ملنے آیا تھا۔ کہ آج کے بعد پھر کبھی اُس سے نہیں ملے گا۔

وُہ ایلینا سے یہ بات نہیں کہہ سکا۔ ان میں سے کسی نے اظہارِ محبت تو کیا نہیں تھا۔ ہاں گذشتہ رات سفر کرتے ہوئے اُنہوں نے پہلی بار ایک دُوسرے کو دیکھا تھا۔ اور محض دو چار باتیں کی تھیں۔

اینڈرسن نے ہال کے دروازہ پر رُک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک کونہ میں اُسے ڈائنا کا مرمریں مجسمہ دکھائی دیا۔ جو فانوس کی روشنی میں زرد نظر آ رہا تھا۔ جیسے حُسن کی دیوی خود اپنے حُسن پر مَر مٹی ہو۔

اینڈرسن نے پُوچھا "ڈائنا کے اس مجسمے میں آپ کے چہرہ کو کس نے زندۂ جاوید بنایا ہے"؟

ایلینا نے نظریں نیچی کر کے جواب دیا "کینووا نے" معلوم ہوتا تھا۔ ایلینا نے وُہ سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ جو اینڈرسن سوچ رہا تھا۔ اینڈرسن نے اُداس اور تھکے لہجے میں کہا "میں آپ سے رُخصت ہونے آیا ہُوں۔ میں ویرونا سے دُور——— بہت دُور

چلا جاؤں گا"

"مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم کون ہو۔ تم پریوں کی کہانیوں کے مشہور و معروف مصنف ہنس کرسچین اینڈرسن ہو۔ لیکن میرا خیال ہے۔ کہ تم حقیقی زندگی میں پریوں کی کہانیوں سے ڈرتے ہو۔ تم میں محبت کرنے کی جرأت ہے نہ ہمت"!

اینڈرسن نے اعتراف کیا۔ "مجھے یہ طوقِ لعنت پہننا ہی نہیں ہے"!

ایلینا نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر حیرت بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "میرے محبوب جہاں گرد شاعر! جاؤ! اس خطرے سے دُور چلے جاؤ۔ تمہاری آنکھوں میں مسکراہٹ کی چمک ضروری ہے۔ میرے بارے میں مت سوچنا۔ لیکن تمہیں اگر کوئی تکلیف ہو۔ تو مجھے یاد کرنا۔ اور میں تمہیں آرام پہنچانے کے لیے نکولینا کی طرح برف پوش پہاڑوں اور بے آب و گیا ریگستانوں کا سفر کرکے تمہارے پاس ضرور آؤں گی"۔

ایلینا آرام کرسی پر گر پڑی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ فانوس میں شمع پگھل رہی تھی۔

اینڈرسن نے اس کی مخروطی اُنگلیوں کے درمیان میں سے ایک چمکتے ہُوئے قطرے کو اُس کے سبز مخلیں لباس میں جذب ہوتے دیکھا۔

وہ تیزی سے اُٹھ کر ایلینا کے پاس گیا۔ اور جُھک کر اُسکے پاؤں چُوم لیئے۔ اور ایلینا نے اپنی آنکھیں کھولے بغیر سر اُوپر اٹھا کر اُس کے لبوں کا بوسہ لے لیا۔

اینڈرسن کے چہرہ پر ایک گرم آنسو ٹپکا۔ اور بہتا ہؤا اُس کے لبوں تک پہنچ گیا۔

ایلینا نے کہا "جاؤ! کاش تمہاری شاعری کا دیوتا تم کو معاف کر دے"!

اینڈرسن کھڑا ہو گیا۔ اور تیزی سے گھر سے باہر نکل گیا۔ ویرونا کے گرجوں کی گھنٹیاں شام کی نماز کے لیئے بج رہی تھیں۔

پھر وُہ لوگ کبھی نہیں ملے۔ لیکن وُہ ملاقات دونوں کو تاموت یاد رہی۔

شاید اسی لیے اینڈرسن نے مرنے سے کچھ دیر قبل ایک نوجوان ادیب کو بتایا تھا۔

"مَیں نے پریوں کی کہانیوں کے لیے بہت بڑی قیمت دی ہے۔ اتنی زیادہ قیمت، کہ کوئی اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔ مَیں نے ان کہانیوں کی خاطر اپنی تمام خوشیاں قربان کر دیں۔ مَیں نے ان حسین گھڑیوں کو ٹھکرا دیا۔ جب تخیلات کی تمام طاقت، چمک اور روشنی، حقیقت کا رُوپ دھار لیتی ہے"۔

"میرے دوست، تخیّل سے اس طرح کام لو کہ وُہ انسانوں کے لیے خُوشی کا پیغامبر ہو۔ نہ کہ اُداسیوں کا....."

ابن الوقت

سید ضمیر جعفری

"ابن الوقت" کی کوئی فیصلہ کُن تعریف کرنا مشکل ہے۔ آرٹ کے بارے میں کوئی دو ٹوک بات نہیں کہی جا سکتی اور "ابن الوقت" ایک آرٹ ہے
نہ حد جس کے پیچھے، نہ حد سامنے!

عام طور پر کہا جاتا ہے۔ کہ "ابن الوقت" زندگی کے عزیز ترین اصولوں اور مقدس سے مقدس قدروں کو فروخت کر دیتا ہے۔۔۔۔۔۔ وہ ایک بہت صیقل شدہ خوش آمدی ہے۔۔۔۔۔ کردار و ضمیر کے ہر سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ اس کی اپنی نہ کوئی شخصیت ہے۔ نہ چاپ، اصول نہ عقیدہ!

لیکن یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں۔ کہ انسان جب باتیں کرنے پر آتا ہے۔ تو سطحی سے سطحی موضوع پر بھی گہری سے گہری باتیں کر سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ "ابن الوقت" سمجھنے کی چیز ہی نہیں۔ جو سمجھ میں آ گیا۔ وہ "ابن الوقت" کیسا!
"ابن الوقت" جس روز سمجھ میں آ گیا یہ سمجھئے کہ ختم ہو گیا ——— مر گیا ——— ادراک کی سرحد جہاں ختم ہوتی ہے "ابن الوقت" وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ سچ پوچھئے تو "ابن الوقت" کو خود بھی معلوم نہیں کہ وہ کیا ہے؟ یہ دراصل ایک نہایت نازک سے توازن کا مسئلہ ہے۔ لوگ توازن کھو بیٹھے پہچانے گئے، جنہوں نے سلیقے سے کام لیا وہ بسا اوقات اپنے وقت کے اکابرین میں شامل ہو گئے۔

ادیب و شاعر کی طرح "ابن الوقت" بھی پیدا ہوتا ہے۔ بنایا نہیں جا سکتا۔ بنایا جائے تو کچھ مزیدار سا نہیں بنتا۔ شاعر کم اور عالم زیادہ بن جاتا ہے۔ مشق و ریاضت سے نکھرتا ہے۔ پھر جس طرح ادب اعلیٰ، درمیانہ اور گھٹیا ہوتا ہے۔ بعینہٖ "ابن الوقت" بھی اعلیٰ، درمیانہ اور گھٹیا ہوتا ہے۔ کبھی ناول کی طرح طویل، کبھی رباعی کی صورت مختصر اور کبھی تو بالکل استعارہ ہی استعارہ۔ دریا بہ حباب اندر۔ لپک کا یہ عالم کہ "ابن الوقت" کا ترجمہ ہی شاید لپک ہو! فرق صرف اتنا ہے کہ ادیب زندگی کو تخلیق کرتا ہے۔ اور "ابن الوقت" اس کو برتتا ہے شاعر بھوکا مرتا ہے۔ "ابن الوقت" مزے کرتا ہے۔

بعض لوگ "ابن الوقت" کو بھاپ بجلی کے زمانے کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی سرشت میں بھاپ اور بجلی ضرور ہے۔ لیکن بھاپ بجلی کے زمانے کی پیداوار ہرگز نہیں ——— "ابن الوقت" کا شجرہ نسب خود وقت ہی کے شجر سے پھوٹتا ہے۔ دونوں کی تاریخ پیدائش قریب قریب ایک ہے۔ جب سے وقت ہے "ابن الوقت" بھی ہے۔ البتہ پہلے شاید زمین سے آہستہ آہستہ اُگتا ہو۔ اب تو مشین میں ڈھلتا ہے ——— وقت اچھے تھے تو "ابن الوقت" بھی عجیب الطرفین تھے۔ جیسا وقت ویسا ابن الوقت"۔ برق اور ایٹم کے دور میں پتھر اور دھات کا "ابن الوقت" کہاں؟
بادشاہ سلامت کے بٹیر کو جو لوگ "رستم و افراسیاب" کہتے تھے۔ اور بڑے بڑے پہلوانوں کی دستارِ فضیلت اتار کر بٹیر کے سر باندھ دیتے تھے۔ وہ احمق نہ تھے۔ اپنے وقت کے نہایت ذہین اور کامیاب "ابن الوقت" تھے۔ چنانچہ تذکروں میں ہم دیکھتے ہیں۔ کہ رستم و افراسیاب اپنی اپنی جگہ "رستم و افراسیاب" اور بٹیر بٹیر ہی رہے۔ البتہ "ابن الوقت" تھے جو روز جشن منایا کرتے۔ اب نہ وہ دولے بادشاہ اور نہ وہ

موتیوں والے بشیر نہ وہ سادہ و معصوم ابن الوقت!

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں!

بادشاہ، ابن الوقت اور بشیر کا قصہ بھی عجیب ہے۔ معلوم ہوتا ہے تینوں ایک دوسرے کے بطن سے نکلے ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہتے۔ رہتے ہیں تو کچھ بیوہ سے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جب سے بادشاہ اُٹھ گئے ہیں، بشیر بھی اُڑ گئے ہیں۔ ابن الوقت نسبتاً زیادہ جاندار نکلا۔ کچھ "انڈر گراؤنڈ" چلے گئے، جو ذرا سمجھ دار تھے انہوں نے جب دیکھا کہ —— ساقی نے بنا کی روِش لطف و کرم اور۔ تو وہ دفتروں اور کارخانوں میں ملازم ہو گئے۔ صنعت، تجارت اور سیاست کے کوچوں میں جا نکلے۔ یہ دیکھ کر بادشاہ اور بشیر بھی بھیس بدل کر واپس آ گئے۔ صورت بدل گئی تھی۔ سیرت وہی تھی۔ وہی بادشاہ وہی بشیر وہی ابن الوقت!

نہ مَیں بدلا نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی

میں کیسے اعتبارِ گردشِ دورِ زماں کر لوں

میں تاریخ کی کسی عالمانہ بحث کا اہل نہیں ہوں۔ مگر کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں۔ کہ دنیا کے بیشتر بادشاہوں کی تاریخ اصل میں "ابن الوقت اور بشیر" کی تاریخ ہے۔ جن چند بادشاہوں نے اپنی تاریخ خود پیدا کی ہے۔ ان کو ابن الوقت چھوڑ گئے۔ یا بصورتِ دیگر بادشاہوں کو تخت و تاج چھوڑنا پڑا۔ بعض اوقات تو یہ محسوس ہوتا ہے۔ کہ اگر "ابن الوقت" نہ ہوتا۔ تو شاید سرے سے کوئی "تاریخ" ہی نہ ہوتی۔۔۔ تاریخ نہ ہوتی تو فلسفہ کہاں ہوتا؛ فلسفہ نہ ہوتا تو ...... بہرحال اس بحث کو مَیں ذرا بعد پر اُٹھا رکھتا ہوں —— کیونکہ اگر بحث طول پکڑ گئی۔ تو صرف تاریخ رہ جائے گی۔ اور "ابن الوقت" نکل جائے گا۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ان تینوں میں سب سے اہم کون ہے؟ —— بادشاہ —— ابن الوقت یا بشیر؟ بدیہی جواب تو یہی ہوگا۔ کہ بادشاہ۔ لیکن صاحب ہر چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں ہوتی —— ذرا ایک لمحے کے لیے یہ نقشہ تو ذہن میں جمائیے کہ بادشاہ سلامت اجلاس فرما رہے ہیں۔ سامنے زرق برق ہیچوان لگا ہے —— ظلِ سبحانی کش لگا کر اِدھر اُدھر خلا میں دیکھ رہے ہیں۔ مگر کوئی "اداشناس" موجود نہیں ہے۔ جو حُقّے کا "بشیر" بنا دے —— یعنی ایک ایک کش پر دو دو مرتبہ اُٹھے۔ تین تین مرتبہ کورنش بجا لائے۔ پھر ہاتھ جوڑ کر عرض کرے کہ خداوند کے خمیرے کی خوشبو سے روم اور چین کی وسعتیں بھر گئی ہیں ..... سلطانِ اعظم نے دیوانِ خاص کے ایک گوشے پر ایک عام نظر ڈالی ہے۔ لیکن کوئی نہیں جو نوبت کی چوٹ پر اعلان کر دے۔ کہ پورے شہر میں موتیوں کا مینہ برس گیا ہے —— غور فرمائیے یہ بادشاہ تو نہ ہوا، بشیر ہوا۔ زیادہ سے زیادہ کوئی خوشحال مزدور ہے۔ جو فتوحات کی مشق میں گرفتار ہے۔ تاج و تخت پر لات مار کر درویشی و گوشہ نشینی اختیار کرنے والے بادشاہ غالباً وہی بادشاہ تھے۔ جن کو "ابن الوقت" اور بشیر میسر نہ تھے۔

ویسے بادشاہ "ابن الوقت" اور بشیر اپنے اپنے مقام پر ایک دوسرے کو بشیر سمجھتے ہیں۔ اور کچھ غلط نہیں سمجھتے —— کیونکہ جس آدمی کو بھی کھرچا جائے۔ ایک سطح پر جا کر ضرور اندر سے "بشیر" نکلتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے۔ کہ بعض لوگ اس کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ لوگ آخر خودکشی بھی تو کر لیتے ہیں ——؟

"ابن الوقت" کا بشیر ہونا نہیں کہ لازمی طور پر نظر ہی آئے۔ یہ تو زندگی کی طرف ایک خاص زاویے سے دیکھنے کا نام ہے

جس کی سب سے بڑی اور غالباً واحد خصوصیت یہ ہے کہ یہ زاویہ وقت اور زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا اور بدلتا جاتا ہے۔

یہاں ایک واقعہ یاد آ گیا — ایک دفتر کے افسرِ اعلیٰ نے بڑی بڑی مونچھیں رکھ لیں — لوگ سمجھے یہ شخص تو شاید سالانہ رپورٹ بھی مونچھوں کا طول بلد ناپ کر لکھے — نتیجہ یہ ہوا۔ کہ پورے محکمے میں ایسے ایک لمبی مونچھ لہرانے لگی۔ ایک صاحب خیر سے کچھ ادیب تھے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا۔ کہ ادب کے ابن الوقت تھے۔ کیونکہ زندگی کے ہر شعبے میں "ابن الوقت" ہوتے ہیں۔ انہوں نے تو ستم ظریفی کی حد کر دی۔ یعنی مونچھوں کے فوائد فضائل پر سو سوا صفحے کی ایک پوری کتاب لکھ ماری۔ باہر سرورق پر لارڈ کچنر کی تصویر تھی۔ تصویر بھی کیا تھی! مونچھیں ہی مونچھیں تھیں۔ اور کتاب کے اندر طب و تاریخ کے حوالوں سے ثابت کیا گیا تھا۔ کہ انسانی عظمت ہمیشہ مونچھوں کے پیچھے پیچھے چلتی رہی ہے۔ جن لوگوں نے مونچھ کے بغیر نام پیدا کیا۔ ان کی عظمت اتفاقی تھی عارضی تھی — نامکمل تھی — مصنف کے قول کے مطابق اگر نپولین کے مونچھیں ہوتیں۔ تو وہ یقیناً "ساری دنیا کو فتح" کر لیتا۔ اور سکندرِ اعظم کو تو بیاس سے لوٹنا ہی اس لیے پڑا کہ بیچارے کے مونچھیں نہ تھیں۔

کچھ پرانے زمانے ہی پر موقوف نہیں۔ مونچھوں کا سلسلۂ فیضان اب بھی جاری ہے۔ مصنف کی رائے میں ہٹلر کی ابتدائی کامیابیوں کا باعث اس کی مونچھ ہی تھی — جتنی مونچھ تھی۔ اتنی ہی کامیابی تھی — سٹالین کی مونچھ بڑی تھی۔ میدان بھی اسی کے ہاتھ رہا۔ ان کے نزدیک دوسری جنگِ عالمگیر دراصل دو مونچھوں کی لڑائی تھی جس میں بڑی مونچھ نے چھوٹی کو شکست دے دی۔

الغرض اس طرح انہوں نے افسر کی مونچھ کو اپنا "شیر" بنا لیا!

تالی ہمیشہ دو ہاتھوں سے بجتی ہے۔ یہ فن بھی اپنے سرپرستوں ہی کے دم قدم سے زندہ ہے۔ تصویر کا یہ رُخ بھی دیدنی ہے ولیِ نعمت آٹھ دس ہزار میل دور سے ٹیلیفون پر بات کر رہے ہیں۔ "ابن الوقت" نے ریسیور اٹھاتے ہی کہا — "نصیبِ دشمناں بندگانِ عالی کی آواز کچھ بھاری سی معلوم ہوتی ہے" — اور بندگانِ عالی کو سچ مچ زکام ہو گیا—

یہ تو سامنے کی موٹی موٹی مثالیں تھیں۔ ورنہ اہلِ کمال نے تو اس فن کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ وہ جدتیں اور باریکیاں پیدا کی ہیں۔ کہ بقولِ غالب

لٹتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ "ابن الوقت" کو تو ایک دنیا بُرا کہتی ہے۔ اور سرپرست کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ حالانکہ اگر برے ہیں۔ تو دونوں، ورنہ کوئی نہیں۔ کیا یہ بھی ایک قسم کی ابن الوقتی ہی تو نہیں؟

میں تو بعض اوقات سوچتا ہوں۔ کہ زمانے نے "ابن الوقت" کے ساتھ منصفانہ سلوک نہیں کیا — تعجب ہے کہ قاتل تک کو ہمدردانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر "ابن الوقت" کے ... نکتۂ نگاہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ حالانکہ "ابن الوقت" سوسائٹی کے بعض طبقوں کے لیے پانی اور ہوا کی طرح ضروری ہے — ذرا تاریخ پر پھر ایک نظر ڈالیے اور انصاف سے فرمائیے کہ اس کے جتنے ٹکڑے عبرت یا اختلاجِ قلب کے بغیر پڑھے جا سکتے ہیں وہ کن لوگوں کی داستان ہیں؟

دوسرے کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنا اور اس کا احترام کرنا کیا خوبی نہیں ہے! اس شعبے میں "ابن الوقت" کا ریکارڈ اتنا شاندار ہے۔ کہ کوئی دوسرا فرد یا ادارہ اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔ حیرت ہے کہ لوگ اس خوبی کو بھی الٹا نقص قرار دیتے ہیں۔

الزام یہ ہے کہ وہ دوسرے کے نقطۂ نگاہ کا بہت زیادہ احترام کرتا ہے۔ سبحان اللہ یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہوئی۔ جیسے کوئی کہے۔ کہ دُنیا میں بہت زیادہ امن قائم ہو گیا ہے!

اب "ابن الوقت" کا ایک بہت بڑا قصور یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ زندگی کے خلاف لڑنے سے گریز کرتا ہے لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا۔ کہ وہ خود اپنے خلاف کس بے جگری سے لڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دُوسرے کے خلاف لڑنے کے بجائے اپنے آپ کو لہو لہان کرنا زیادہ مشکل ہے اور شاید عجیب تر بھی!

میں تو یہاں تک بھی کہنے کو تیار ہوں کہ "ابن الوقت" مرنے کی نہیں جینے کی لڑائی لڑتا ہے۔ ویسے اس نے اصولاً کشت و خون کو ہمیشہ روکا، اور حسن و زیبائش، آسایش و کشادگی اور ذائقہ و لذت کو فروغ دیا ہے وہ گولی کا زخم نہیں باغ کا پھول ہے۔ پھول سے آخر لڑنے کی توقع ہی کیوں کی جائے! میں یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ آج تک کوئی "ابن الوقت" خون خرابے کا باعث نہیں ہوا۔ لیکن مجھے یقین ہے۔ کہ اس قسم کا "ابن الوقت" کوئی گھٹیا ابن الوقت ہوگا۔ ابوالہوس آخر کس پیشے میں نہیں! مناسب تو یہ تھا۔ کہ معاشرہ پیام اس کے اعتراف میں "ابن الوقت" کا شکریہ ادا کیا جاتا۔ لیکن میر نے سچ ہی کہا تھا:-

ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

خود ادب اور لٹریچر پر ابن الوقت کے بے شمار احسانات ہیں۔ اکثر و بیشتر ملک الشعراء کون بزرگوار تھے؟ آدمی وہ کیسے بھی ہوں یہ بتائیے کہ کیسا کیسا تابدار شعر وہ دُنیا کو دے گئے ہیں؟ اور جو شخص تہذیب و آدمیت کا اتنا بیش بہا ورثہ چھوڑ جائے۔ وہ خود بنیادی طور پر گھٹیا آدمی کیونکر ہوا؟ قصور وقت کا ہے "ابن الوقت" کا نہیں!

داستانوں کے کتنے چٹخارے جن سے زندگی کی ہزاروں خوبصورتیاں اور لذتیں وابستہ ہیں۔ کس نے مہیا کی ہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ "ابن الوقت" "مسائلِ حیات" کو حل نہیں کرتا۔ لیکن یہ بھی دراصل اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ جب وہ مسائل پیدا ہی نہیں کرتا۔ تو حل کیوں کرے؟ دُوسروں کی پاداش وہ کیوں بھگتے؟ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ کہ ابن الوقت احمق نہیں ہوتا۔ وہ تو محبت تک کی قیمت وصُول کر لیتا ہے۔

مولوی ڈاکٹر نذیر احمد کے عظیم ناول "ابن الوقت" کو جو ابدیت نصیب ہوئی ہے۔ وہ اُردو کی بہت کم کتابوں کے حصے میں آئی ہے۔ یہ ناول کس کے خونِ جگر سے لکھا گیا تھا؟ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں۔ کہ "ابن الوقت" نہ ہوتا تو کچھ عجب نہ تھا۔ کہ اُردو ادب اس ناول سے بلکہ خود مولوی ڈاکٹر نذیر احمد ہی سے محروم رہ جاتا۔ اور یہ کتنا بڑا تہذیبی زیان ہوتا؟

ابن الوقت کی بدقسمتی اصل میں یہ ہے۔ کہ وہ اپنی تاریخ لکھنے کے بجائے دوسروں کی تاریخ لکھتا رہا ہے۔ اپنی تاریخ خود لکھ گیا ہوتا تو دُنیا آج اُس کی خوبیوں کا بھی اندازہ کر سکتی۔ لیکن بہر حال اہلِ نظر تو جانتے ہیں کہ وقت کی تاریخ ابن الوقت ہی کی تاریخ ہے۔

"ابن الوقت" کے تذکرے میں سنجیدہ ہونے کی گنجائش ہے نہ ضرورت:

یہ خود "ابن الوقت" کے روایات کے خلاف ہے۔ لیکن ایک بات میں پوری سنجیدگی سے کہنا چاہتا ہوں۔ خواہ آپ کو میری سنجیدگی پر ہنسی ہی کیوں نہ آ جائے۔ لوگ "ابن الوقت" کو اس شدت و کثرت سے کوستے کیوں ہیں؟ مجھے تو یہ کچھ رواجی اور رسمی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ کیا اس پردے میں خود اپنا دفاع تو مطلوب نہیں ہوتا؟ میں نے تو جب کبھی "ابن الوقت" کو معن طعن کرنا چاہا۔ معاً خود اپنے اندر کوئی بشیر پھڑپھڑانے لگا۔ کوئی بادشاہ سلامت ٹہلتے ٹہلتے اچانک سامنے آ گئے۔ سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آ یا!

(عزیزی سعید کی فرمائش پر) باقر مہدی

یہ پھول ہیں تو مگر داغدار ہیں کتنے
امانتِ غمِ فصلِ بہار ہیں کتنے ؟

ہماری آنکھوں میں رقصاں ہے جستجو کی چمک
ہمارے پہلو میں پیوست خار ہیں کتنے؟

ہمارے چہرے ہیں آئینے بیکسی کے مگر
ہمارے سینے میں غم کے مزار ہیں کتنے؟

چمکتے رہتے ہیں یوں تو ہزارہا انجم
مگر ان اشکوں سے وہ تابدار ہیں کتنے؟

سمجھنے والے نیا غم سمجھ نہیں سکتے
حیاتِ نو کے ابھی رازدار ہیں کتنے؟

ملے گی ہم کو بھی منزل مگر خبر ہے کسے
کہ راہِ عشق میں بجابل غبار ہیں کتنے؟

بہار آئے گی لیکن ہماری دُنیا میں
خزاں بدوش ابھی لالہ زار ہیں کتنے؟

بلا سے جہدِ مسلسل میں زندگی گزرے
کہ حادثات کے اُمیدوار ہیں کتنے؟

نشاطِ غم سے معطر دماغ کر جائے
صبا سے کہہ دو کہ ہم سوگوار ہیں کتنے؟

نئی غزل کو ابھی ناتمام رہنے دو،
سعید اپنی طرح بے قرار ہیں کتنے؟

اختر ہوشیارپوری

رقصِ موجِ بہار تک پہنچے،
ہم گلوں کے دیار تک پہنچے

یہ کرشمے بھی ہیں کہ عشق میں ہم،
دید سے انتظار تک پہنچے

منزلِ غم بھی ہم سے طے نہ ہوئی
لوگ صبر و قرار تک پہنچے

دی تو ہے دل نے بے صدا آواز
دیکھیں کب گوشِ یار تک پہنچے

چلتے چلتے ترے خیال میں ہم
گردشِ روزگار تک پہنچے

پھر صبا کی طرح ہم آوارہ،
شاخِ گل سے بہار تک پہنچے

اب جو پہنچے تو بوئے گل اختر
دلِ بے اختیار تک پہنچے

(اظہر منیر)

محرمِ عشق ہیں - ہونٹوں کو سیئے بیٹھے ہیں

شیشۂ دل میں کئی داغ لیے بیٹھے ہیں

ماہ وانجم پہ پہنچ کر بھی نہیں رُکتی نظر

رُخ کسی اور ہی منزل کا کیے بیٹھے ہیں

اب تو کچھ اور ہی عالم ہے فروغِ غم سے

صورتِ جاں ترے ہر غم کو لیے بیٹھے ہیں

بھُولتا ہی نہیں اس نرگسِ شہلا کا کرم ،

ایک مے ہے کہ شب و روز پیے بیٹھے ہیں

ایک ہی شکل ہے سو رنگ سے دل میں آباد

ایک ہی عکس کے سَو عکس لیے بیٹھے ہیں '

جب سے چھوڑی ہے تمنائے سکوں اے اظہر

ہر کٹھن راہ کو ہموار کیے بیٹھے ہیں

○

کشور ناہید

شکوۂ خزاں کوئی لب پہ کس طرح لائے
جب بھری بہاروں میں دیکھیے پھول کملائے

کچھ کہو کہ خاموشی بے سبب نہیں ہوتی
کچھ تو ہے جو آنکھوں میں آج اشک بھر آئے

رہبرو کہاں ہو تم، کچھ یہ راز سمجھاؤ
منزلوں پہ آکر بھی کارواں ہیں پچھتائے

سر کسی کا سودائی، دل کسی کا شیدائی
کون کس کو سمجھائے، کون کس کو بہلائے

ایک حسین عالم کے دل نشیں تخیل پر
حاکمِ زمانہ نے کتنے دام پھیلائے

آپ ایک لغزش پہ ہاتھ ملتے پھرتے ہیں
ایک ہم جو ٹھکرا کر منزلیں چلے آئے

ہم سنا تو دیں ناہید قصۂ غمِ ہجراں
یہ فسانہ دکھڑوں کا کون پھر دہرائے

فرید عرش

بھٹکے پھرے جو دشت و بیاباں میں گھر سے دُور
منزل ہے اُن کی آج بھی حدِ نظر سے دُور

صرصر نے اُن کو وقت سے پہلے بجھا دیا،
جلتے تھے جو چراغ نسیمِ سحر سے دُور

سر پھوڑنا بھی اب نہ رہا اختیار میں
دشتِ طلب میں پھرتے ہیں دیوار و در سے دُور

سیلِ بہار اب کے بیاباں میں رُک گیا،
اب کے برس تو شہر سے بادل بھی برسے دُور

اے ساکنانِ شہرِ طرب کچھ خبر بھی ہے
اب تک ہجومِ شب زدگاں ہے سحر سے دُور

تو جلوہ گاہِ ناز سے ہم کو نہ دے صدا
ہم لوگ آگئے ہیں تری رہگذر سے دُور

کس کو سنائے عرش غمِ دل کی داستاں
یارو نکل گیا ہے زمانہ نظر سے دُور

اسرار زیدی

اِک اِک روش چمن کی سنواری ہے دوستو
اس طرح ہم نے عمر گزاری ہے دوستو

بے جنبشِ قدم کوئی منزل، نہ کارواں
گویا سکوتِ مرگ کا طاری ہے دوستو

دن تو کسی کے غم میں بہر طور کٹ گیا
اہلِ جنوں پہ رات یہ بھاری ہے دوستو

دل ہے متاعِ زیست، خلش ہے متاعِ دل
بس اک یہ کائنات ہماری ہے دوستو

کانٹے قبول کر لیے پھولوں کے نام پر
بازی یہ ہم نے جیت کے ہاری ہے دوستو

بوجھل فضا، فسردہ چمن، شاخ بے ثمر
یہ اہتمامِ فصلِ بہاری دوستو

○

انجم اعظمی

دہر میں پھرتا ہے جس بادِ صبا مستانہ،
تیرے دیوانے کا انداز ہے اک رندانہ

شوق کے پھول کھلے، حسن کی قندیل جلی
سج گیا آپ کے آتے ہی مرا کاشانہ

چاہتا ہوں کہ یونہی محوِ تماشا ہو کر
جلوۂ حسن کو دیکھا کروں بے تابانہ

غم سے جو ہار گئے اُن کو ٹھکانہ نہ ملا
زندگی ڈھونڈنے والوں کو ملا میخانہ

جاں نثارانِ محبت کا پتہ دیتی ہے
شمع پہ بکھری ہوئی خاکِ دلِ پروانہ

آج کی رات تو جی بھر کے ہمیں پینے دو
آج کی رات تو گردش میں رہے پیمانہ

ذکر چھڑ جاتا ہے جب انجمِ وحشی کا کبھی
ہنس کے کہتا ہے کوئی وہ تو ہے اک دیوانہ

سید اختر حسین

آج پھر دید کے امکاں جاگے
چار سو چشمۂ حیواں جاگے

یاد آیا تیرا ہنگامِ سفر
کچھ ستارے سرِ مژگاں جاگے

جلوہ افروز ہُوا تیرا خیال
پھر نگاہوں میں گلستاں جاگے

لذتِ زخمِ جگر یاد آئی
پھر تری دید کے ارماں جاگے

تیری رفتار سے پامالِ ستم
صورتِ چشمِ غزالاں جاگے

کوئی جلتی ہوئی حسرت بھی نہیں
کس طرح شامِ غریباں جاگے

○

مظہر عباس انصاری

کچھ وہ صورت ہے ترے لب پہ ہنسی آنے کی
کھل گئی جیسے حقیقت مرے افسانے کی،

مسکراتی ہے کلی جب بھی کسی گلشن میں
چوم لیتی ہیں ہوائیں کسی ویرانے کی،

شمع دیتی رہی ہر شام جو پیغامِ حیات
زندگی روز سنورتی رہی پروانے کی،

جس جگہ دستِ حنائی سے چلا دورِ شراب
آہ! سوئی وہیں قسمت مرے پیمانے کی

ہم انہیں تکتے ہیں حیرت سے کبھی حسرت سے
ایسی حالت نہ ہو یارب کسی دیوانے کی،

خود ترے عکس کو آئینہ میں آتا ہے حجاب
کس قیامت کی ادا ہے ترے شرمانے کی

چاک ہو جاتے ہیں کیوں اپنے گریباں مظہر
جب بھی ہوتی ہے خبر فصلِ بہار آنے کی

پڑھنے والوں کے خطوط

عشرت رحمانی

"ادبِ لطیف" جس انداز سے ادبی دُنیا کی خاموش خدمت انجام دے رہا ہے وہ داد و تحسین سے بالاتر ہے۔ اور اس کے لیے آپ کی مساعیٔ حسنہ کے مشکور ہیں۔

"تکرّبات" کے تحت آپ نے ادبی مباحث کا سلسلہ چھیڑ کر ایک دلچسپ اور مفید باب کا اضافہ کیا ہے۔ خصوصاً اس دور میں جبکہ تنقیدی ادب کا معیار ترقیٔ معکوس کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ ہمارے فاضل نقاد ذاتی اغراض اور خویش نوازی کے دائرہ میں ایسے گم ہو کر رہ گئے ہیں کہ دُنیائے ادب کا جائزہ پیش کرتے وقت گرد و پیش پر نگاہ ڈالے بغیر اپنے مخصوص و مرغوب دائرہ ہی کو ساری دُنیا تصور کر لیتے ہیں۔ سائنس کے اس جدید تنقیدی دور میں جبکہ توقع کی جاتی ہے۔ کہ اُردو ادب میں نقد و تبصرہ کی نئی مفید راہیں کُھلتی نظر آئیں۔ ہوتا یہ ہے کہ اخبارات و رسائل کے صفحات میں "نقادِ ادب" پر بے لاگ تبصرہ کی بجائے احباب مصنفین کی مدح سرائی نظر آتی ہے۔ باقی ہمارے ملک میں آئے دن جو مختلف علوم و فنون پر نئی مطبوعات شائع ہوتی ہیں۔ ان میں سے اکثر کا کوئی ذکر تک نہیں کیا جاتا۔ افسوس کے ساتھ دیکھنے میں آتا ہے کہ ہمارے بعض مشہور نقاد جب ادبی جائزہ پر قلم اُٹھانے بیٹھتے ہیں۔ تو وہ اپنا فرض فراموش کر کے علم و ادب کی بحث پسِ پُشت ڈال دیتے ہیں۔ اور احباب کا تذکرہ چھیڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ اگر ذکر "ایران" کا کرنا ہے" اور ان کے کسی خاص دوست کا ذکر اس سلسلہ میں نہیں ہو سکتا۔ وہ بستے ہوں توران میں تو یہ بیچارے نقاد مجبوراً "ایران کو چھوڑ کر توران تک جا پہنچتے ہیں" تاکہ کسی طرح دوست نوازی کا فرض ادا کر سکیں۔ مقصد یہ کہ اگر ۱۹۵۶ء کے ادب کا جائزہ پیش کرنا ہے۔ اور نقاد موصوف کے کسی بزرگ یا دوست نے ۱۹۵۶ء میں کوئی کتاب یا کسی موضوع پر مقالہ نہ لکھا ہو۔ تو مجبوراً "۱۹۵۶ء کو ۱۹۵۵ء سے ملا کر ان کی فضیلت اور سابقہ خدمت کے راگ ضرور گانے پڑتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے بعض نقاد حضرات نے اپنے اُوپر زبردستی کا ایک فرض یہ بھی عائد کر لیا ہے۔ کہ اگر وہ چند تنقیدی مضامین لکھتے رہے ہوں۔ تو ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ تمام علوم و فنون کی مہارت کا سہرا بقلم خود اپنے سر باندھ کر بلا تکلف ہر موضوع پر تنقید کی جولانیاں دکھانے لگیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر آپ فنِ ڈراما پر کوئی تنقیدی مضمون پڑھ رہے ہوں۔ تو ابتدا سے انتہا تک اسے پڑھ چکنے کے بعد آپ یہ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ کہ اس مضمون کا فن سے کیا تعلق تھا؟ اور اس مضمون میں ڈراما کا ذکر بار بار کیوں آتا رہا؟ معاف کیجئے بات کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ تو عرض کرنا یہ تھا کہ تنقیدی معیار ترقی کی بجائے پستی کی طرف نظر آتا ہے۔ اس سے زیادہ تر ذمہ دار ہمارے بعض نام نہاد اعلیٰ رسائل کے وہ فاضل مدیر ہیں۔ جو تعلقاتِ ارادت یا دوستی کے اندر فرائض انجام دینے پر مجبور ہیں۔ اور باقی خیریت ہے۔

اشد ضرورت ہے کہ مرقت لشیوع رسائل میں افسانوں اور منظومات وغیرہ کی کثرت کی بجائے تنقیدی مضامین کی طرف زیادہ توجہ کی جائے۔ اور ملک کی موجودہ رفتارِ ادب کا صحیح جائزہ وقتاً فوقتاً اس انداز سے پیش کیا جاتا رہے جس سے عوام میں "ادبِ اردو کے صحیح مقام کی تمیز پیدا ہو۔ معاندانہ یا جانب دارانہ تنقید کے خلاف ادبی جہاد کر کے خلوص و صداقت اور ادبی یگانگت داتحاد کی راہیں پیدا کی جائیں۔ تاکہ ہمارا ادب صحت و سلامتی اور پاکیزگی کا علمبردار ہو۔
مختصراً عرض ہے کہ آپ "ادبِ لطیف" میں "تنقیدی ادب" کا معیار اور بلند کریں۔ اور مکتوبات کے تحت ادبی مباحث کا سلسلہ وسیع ہو جائے۔ تو ایک ضروری اور اہم خدمت انجام پا سکے۔ بات تو چھوٹی سی تھی۔ لیکن ذرا لمبی ہو گئی۔ معذرت خواہ ہوں۔

پروفیسر انور رومان

اُردو زبان ہماری سیاسی جدوجہد کا ہی ایک نعرہ یا مقصد نہیں تھی۔ بلکہ اس کے نقطۂ اجتماع بننے کی وجہ یہ تھی کہ یہ نہ صرف ہماری یک ہزار سالہ حکومت اور اس کے ایرانیت سے متاثر تمدن کا ثمرہ تھی۔ بلکہ اس میں برِصغیر کے مسلمانوں کے معاشرے کی جھلکیاں بھی پائی جاتی تھیں۔ غالب ہو یا مومن، نظیر ہو یا اسمٰعیل، آزاد ہو یا شبلی، حالی ہو یا اکبر، ابوالکلام آزاد ہوں یا جوش۔ ان سب نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں ہمارے معاشرے کی تصویر اُتاری۔ اس کی بنیادی اور باطنی معنویت کی تفسیر کی۔ اور اُس کے خارجی وجود کی تعبیر کی کوشش کی۔
ہونا تو یہ چاہیے تھا۔ کہ پاکستان بننے کے بعد اس کی دو گونہ خصوصیتیں باقی رہتیں۔ لیکن ہوا یہ کہ ہم نے اُس کی پہلی صفت کو یوں کا درجہ دے دیا۔ اور دوسری کی ترسیع میں مجرمانہ بخل سے کام لیا۔
اُردو زبان اپنی ادبی حیثیت میں دو خطوں کی زبان ہے۔ ایک گنگا اور جمنا کا علاقہ جو اسلامی تمدن کا ایک ہزار سال تک مرکز رہا۔ اور دوسرا لاہور، جس کی اصل تہذیبی اہمیت بیسویں صدی کے آغاز میں ظہور پذیر ہوئی۔ یہ دونوں خطے بیک وقت اُردو زبان و ادب کی آبیاری کرتے رہے۔ لیکن اس صدی کے آغاز سے جوں جوں پیچھے جائیں اُردو زبان و ادب پر پہلے خطے کا اثر عمیق تر ہوتا گیا ہے۔ اور جوں جوں آگے بڑھیں دوسرے خطے کا اثر شوخ تر ہوتا نظر آتا ہے۔ یہاں اُردو ہماری نئی سماجی و سیاسی کروٹ اور نئے فنی خیالات سے متاثر ہوئی۔ اقبال، ظفر علی خاں، سالک، مہر، اختر شیرانی، میرزا ادیب، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، سید عابد علی، سید عبداللہ، فارغ بخاری، شیر فضل جعفری، وغیرہ اس نئی ادبی زندگی کے مظہر ہیں۔ پاکستان کے بعد مہاجرین کے ساتھ گنگا اور جمنا کی اُردو بھی گئی۔ اہلِ زبان اور اہلِ اکتساب میں ربط و ضبط بڑھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے بیشتر اُردو دان اُردو کو ایک مکمل زبان سمجھنے لگے۔ ایک مقدس اثاثہ!!
اوّل تو یہ بات ہے کہ اُردو کا وجود بھی دوسری زبانوں کی طرح پلک دار اور ارتقا پسند ہے۔ نفرت پذیری اس کا ایک تابندہ جوہر ہے۔
دوم یہ کیسے ممکن ہے؟ کہ آپ رہیں دریائے سندھ پر اور زبان بولیں اور لکھیں گنگا اور جمنا کی؟
سوم یہ کہ جن علاقوں میں اُردو زبان پہنچی ہے۔ اُن کی مادری زبان یہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان علاقوں کو اُردو زبان و ادب من و عن قبول کر کے پرانی ڈگر پر چلنا چاہیے۔ یا اسے ان علاقوں کے مطابق ہونا چاہیے؛ یعنی اُردو انسانوں کے بیٹے ہیں یا انسان

اُردو کے لیے ہیں؟ میرے لیے اس سوال کا جواب بہت آسان ہے۔ اور وہ یہ کہ اُردو زبان و ادب کو ان علاقوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ :-

۱۔ اُردو زبان میں علاقائی بولیوں کے بیسیوں الفاظ جذب ہو جائیں گے۔

۲۔ اُردو ادب میں طبعزاد و نگارشات کے علاوہ علاقائی ادب دلوک ادب کے ترجمے بھی زیادہ ہوں گے جو علاقائی تمدن کے مظہر ہیں۔

۳۔ اس طرح اس زبان کا "باایمان" طبقہ اور لاہور کا سکول جس پر اکثر جمود طاری ہوتا رہتا ہے۔ نئی راہیں دیکھ سکیں گے اور محسوس کر سکیں گے۔ کہ پاکستان ان پسماندہ علاقوں کی صدیوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے اور اُردو زبان و ادب اس علاقے کا ایک الہامانہ اظہار بن جائیں گے !!!

بروہی خطۂ قلات کی ایک قدیم قوم ہے جس کی زبان ڈاکٹر گریرسن اور دوسرے ماہرین لسانیات کے مطابق جنوبی ہند کی دراوڑی بولیوں سے ملتی ہے۔ غالباً اس لیے کہ تین ہزار سال قبل مسیح کی وادیٔ سندھ کی تہذیب انہی دراوڑوں نے تشکیل کی۔ پندرہ سو سال قبل مسیح کے قریب آریوں کی بربریت نے اس مالامال لیکن زوال پذیر تہذیب کی علمبردار قوم کو مار دیا۔ اور غلام بنا لیا۔ لیکن اس کے کچھ لوگ قلات کے پہاڑوں میں پناہ گزین ہو گئے۔ بروہی یا تو براہ راست انہی کی اولاد ہیں۔ اور یا پھر رائج الوقت نظریہ کے مطابق بزرگ بروہی (دبروہی) کوہ البرز کے دامنوں میں رہنے کے بعد چھٹی صدی عیسوی میں عہدِ نوشیرواں میں یہاں وارد ہوئے۔ اور اُن کی آمد پر اُن کا رابطہ اُس قوم سے ہوا۔ جو قدیم دراوڑوں کا اثر یافتہ تھی۔ اس وقت بروہیوں کی آبادی پانچ لاکھ کے لگ بھگ ہے اور وُہ زیادہ تر سابقہ ریاست قلات کے سارآوان اور جھالاوان اضلاع میں رہتی ہے۔ چونکہ یہ لوگ صدیوں سے مخصوص پہاڑی اور ریگستانی علاقوں میں مقیم یا خانہ بدوش ہیں۔ اس لیے اُن کا لوک ادب میدانی ادب سے یقیناً مختلف ہے۔ اُن کی مختصر آبادی اور دُور افتادگی سے یہ بھی خدشہ ہے کہ کہیں ہمارے ادب کا دائرۂ مشاہدہ انہیں نظرانداز ہی نہ کر دے۔ اور اُن کا کوئی نقش ہمارے ادب میں اُجاگر نہ ہو سکے۔ لہٰذا یہاں میں انہی کی ایک لوک کہانی لکھتا ہوں۔

گو میں بروہی نہیں سمجھتا تاہم تین ہزار میل دُور سے آنے والے انگریز فاتحین کے ہراول دستے جو پادریوں کی صورت میں یہاں پہنچے۔ انھوں نے بروہی سیکھی اور بروہیوں میں عیسائی تعلیمات پھیلانے کی کوشش کی۔ گو وُہ اپنا مقصد حاصل نہ کر سکے۔ تاہم انھوں نے یہاں کے لوک ادب کو کافی حد تک محفوظ کر دیا۔ میں نے ریواینڈ ڈی جے ایل بیٹر کی مرتبہ کتاب سے اس کہانی کو اُردو جامہ پہنایا ہے۔ اور اپنے چند دوستوں سے انگریزی ترجمے کی صحت ——— کی تسلی کر لی ہے۔

یہ افسانچہ انسانی زندگی میں کہانی کی اہمیت کو آشکار کرتا ہے۔ بروہیوں کے ہاں افسانچہ یا قصہ من گھڑت یا خیالی چیز نہیں۔ بلکہ ایک حقیقی تجربہ، آپ بیتی اور سرگذشت کا نام ہے۔ جو ہمارے لیے یقیناً سبق آموز ہے۔ اُن کے لیے زندگی، جھوٹ، فریب یا تصور نہیں۔ بلکہ ایک حقیقت ہے ـــ ایک تلخ حقیقت جس میں عموماً امیر و مقتدر انسان اکثر شعوری طور پر اور کبھی کبھار غیر شعوری طور پر غریب دنادار انسانوں کو کچل ڈالتے ہیں۔ اس تلخ حقیقت میں ایک شیرینی بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ غریب و نادار انسان جب تک اپنے زورِ بازو، تدبیرِ ذہن اور تنویرِ جذبات سے کسی چیز کی تخلیق کرتا ہے۔ وہ بہت خوش وقت انسان ہے۔ لیکن جونہی اس کی یا تعمیر

مکمل ہوجاتی ہے۔ اُسی وقت تلخی شروع ہوجاتی ہے۔ اور امیر آدمی اسے ہتھیا لیتا ہے ——— افسانچے میں گھریلو زندگی بمقابلہ خانہ بدوش زندگی، پر بھی ایک لطیف طنز ہے !!

"شاہزادی دُور بین لگائے محل کے ایک جھروکے میں بیٹھی ہُوئی تھی۔ اُس نے دُور سڑک پر تین راہگیروں کو آتے ہُوئے دیکھا۔ جن میں سے دو جوان تھے۔ اور ایک ضعیف! ان کے راستے میں ایک ندی پڑتی۔ ضعیف آدمی نے دونوں جوانوں کو اپنی پُشت پر بٹھا کر ندی کو عبُور کیا۔ شاہزادی حیران و پریشان ہُوئی کہ مردِ پیر ان دونوں کو اٹھا کر ندی عبُور کرے آخر اس کا کیا سبب ہے؟ پتہ نہیں ان تینوں کے درمیان کیا معاملہ ہے؟

اس نے اپنی خادمہ کو حکم دیا۔ کہ وُہ سڑک پر جا کر کھڑی ہو جائے۔ اور ان تینوں کے پہنچنے پر انہیں بُلا لائے تاکہ وہ ان سے استفسار کر سکے کہ بُوڑھا آدمی ان دونوں کو اُٹھا کر کیوں لایا۔ حالانکہ برنا کو پیر کا سہارا ہونا چاہئیے چنانچہ خادمہ سڑک پر جا کھڑی ہُوئی۔ جب وہ تینوں وہاں پہنچے تو وہ اُنہیں شاہزادی کے حضُور میں لے آئی۔

شاہزادی نے جوانوں سے پُوچھا "تم نے مردِ ضعیف کو کیوں اتنی تکلیف دی؟" انہوں نے کہا "ہمارے درمیان ایک معاملہ ہے۔ جسے ہم بیان کرتے ہیں"! شاہزادی نے کہا "تم وہ معاملہ ہمارے گوش گزار کرو"۔ ضعیف آدمی نے بیان شروع کیا "ہم تینوں سنگتی (ہم سفر) تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ اگر میں انہیں کوئی قصہ سناؤں تو یہ مجھے اٹھا کر ندی عبُور کرا دیں گے۔ لیکن اگر میں نہ سنا سکوں۔ تو یہ سنائیں گے اور میں انہیں اُٹھاؤں گا۔ یہ شرط ہم تینوں میں طے ہو گئی۔ لیکن میں کوئی قصہ نہ سنا سکا۔ لہٰذا میں نے ان سے کہا "آپ قصہ سنائیں اور میں آپ کو پُشت پر اُٹھاؤں گا۔" تب اُنھوں نے قصہ سُنا دیا اور میں اُنہیں پُشت پر اُٹھا لایا۔"

شاہزادی نے کہا "کتنی افسوسناک بات ہے! تمہارے بال سفید ہو گئے ہیں۔ لیکن تمہیں ایک قصہ تک یاد نہیں! اور تمہیں اس کے لیے اتنی تکلیف برداشت کرنا پڑی! تم کہاں بیٹھے پلے ہو؟ تم نے اپنی عمر کیسے گذار دی؟ کہ تم کبھی سرگذشت سے دوچار نہ ہوئے؟ ایک قصہ بھی تمہیں یاد نہیں؟" پھر شاہزادی نے کہا "ہمہ تن گوش ہو جاؤ! میں تمہیں ایک قصہ سناتی ہوں۔ باوجودیکہ میں کم سن ہوں پھر بھی مجھ پر ایک سرگذشت بیتی ہے . . .

"کچھ عرصے کی بات ہے۔ مجھے ایک خوش صورت نوجوان سے عشق ہو گیا۔ وہ بہت باکمال آدمی تھا۔ ہم دونوں میں دوستی کی پینگ بڑھ گئی۔ لیکن ہم پاکیزہ رہے۔ ایک دفعہ وہ رات کو میرے پاس آ گیا۔ اور ہم دونوں پاس پاس بیٹھ گئے۔ اتنے میں میرے بادا (باپ) کی آواز آئی۔ میں نے وحشت زدہ ہو کر اپنے دوست کو ایک صندوق میں بند کر دیا۔ اسی عرصے میں میرے بادا آ گئے۔ اور اُسی صندوق پر بیٹھ گئے۔ اس بیچارے کو اس صندوق میں تین چار گھنٹے گذارنے پڑے۔ جب میرے بادا چلے گئے۔ تو میں نے اسے باہر نکالنے کے لیے صندوق کھولا۔ لیکن میں نے اُس کی لاش پائی۔ میں ایک سخت مشکل میں پڑ گئی۔ اور مجھے سمجھ نہ آتا تھا۔ کہ میں اس کی لاش کو کیا کروں؟"

"اے بڈھے کھوسٹ! دیکھ مجھ پر کیا بیتی! تمہاری تو عمر گزر گئی ہے۔ لیکن تمہیں کوئی قصہ ہی یاد نہیں!"
پھر شاہزادی نے بوڑھے کو بہت سا انعام دیا۔ اور اُنہیں رخصت کر دیا۔ اور اس فکر میں غرق رہی کہ اس آدمی نے اپنی ساری عمر کیسے گذار دی؟ شاید وہ گھر کی چار دیواری میں ہی مقید رہا تھا!!"

میں نے سیدھی سادھی لوک کہانی کا بہت آسان ترجمہ پیش کر دیا ہے۔ اور میرے خیال میں یہی ہونا بھی چاہیے تھا خط کشیدہ الفاظ اسی طرح برہی زبان میں استعمال ہوتے ہیں۔ گو تلفظ میں کہیں کہیں فرق ہے۔

عزیز اثری

"ادبِ لطیف" کا تازہ شمارہ ملا۔ اس مرتبہ "ادبِ لطیف" نے خاصا انتظار کرایا۔ اس تاخیر پر نہ تو آپ سے گلہ ہے۔ اور نہ کسی طرح کی حیرت ہی ہوئی ہے۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے۔ کہ آج موٹے موٹے پہلوان رسالوں کی دھکم پیل میں آپ دُبلے پتلے "ادبِ لطیف" کو کیونکر بچائے ہوئے ہیں۔ بُک سٹالوں پر ضخیم پرچوں کے پہلو میں لیٹا ہوا "ادبِ لطیف" اتنا لطیف لگتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادب نہیں محض ادب کی رُوح ہے۔ جو بظاہر جسم نہیں رکھتی۔ لیکن ہر جگہ جاری و ساری ہے۔

اس شمارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کا "ایسے" پر مضمون بڑا معلوماتی ہے۔ لیکن بہتر ہوتا کہ "ایسے" کا کوئی موزوں اُردو نعم البدل بھی رائج کیا جاتا۔ افسانوں میں ترجمے کے علاوہ ریاض بٹالوی کا "بہتر" خاصا اثر انگیز ہے۔ آپ کا ڈراما "لفافے" بالائی طبقے کے جوڑے پر گہرا طنز ہے۔ بلیک میلنگ سے کمایا ہوا روپیہ ایک دوسری طرح کی "بلیک" کی نذر ہو جاتا ہے۔ اور اس بلیک کے پردے میں اخلاقی اقدار اور میاں بیوی کے نازک رشتے میں پیدا ہونے والے ناسور چھپے رہتے ہیں۔ یہ ڈراما موضوع کے لحاظ سے آپ کے دوسرے ڈراموں سے ہٹ کر ہے۔ ڈرامے میں رفتار قدرے سُست رہی ہے۔ شاید اسی لیے طنز کھلا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ نے اتنے شدید اور گہرے طنز کو لفافے میں ڈال کر پیش کیا ہے۔

اس شمارے میں سب سے زیادہ اہم وہ سطریں ہیں۔ جو آپ نے "افکار و مسائل" کے باب میں لکھی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ آپ نے اس معاملے میں بڑی جرأت بلکہ اجتہاد سے کام لیا ہے۔ آج کل نقادوں کے بارے میں کچھ لکھنا بالکل ایسا ہی ہے۔ جیسا اپنے علاقے کے تھانیدار پر نکتہ چینی کرنا۔ ان دنوں اکثر تنقیدیں پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے۔ کہ ہمارے فاضل نقادوں نے بھی بستہ ب کھول رکھا ہے۔ یا کم از کم سیاہ و سفید فہرستیں ضرور بنا رکھی ہیں۔ بہت کم ادیبوں کا نام ایک فہرست میں لکھا ہے۔ اور دوسرے سب کا نام دوسری فہرست یعنی "بلیک لسٹ" میں۔

یہ ہمارے ہاں جو ادب میں جمود کی دہائی دی جاتی رہی ہے۔ میرے خیال میں اس کی تہ میں بھی یہی فہرستیں کارفرما ہیں۔ آپ کا خیال ہے۔ کہ ان فہرستوں کی ترتیب اور تیاری انصاف کشی، جانب داری اور دیانت سے گریز پر مبنی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہمارے محترم نقاد تو تنقید کی بنیاد یعنی مطالعے، تفکر اور تجزیہ کرنے کی بصارت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ دراصل ان نقادوں کی تن آسانی ـــ اور سہل انگاری نے بھی ہماری تنقید کو توازن اور دیانت سے محروم کر دیا ہے۔ ہمارے ہاں تنقید تجزیے اور لچک سے محروم ہو کر فارمولا بن گئی ہے۔ فارمولا یہ ہے کہ چند بڑے بڑے نام گنواؤ، یا ایسے دو چار نئے لکھنے والوں کا ذکر کرو جن سے کسی طرح سے ذاتی مراسم، مصلحت

یا غرض وابستہ ہے۔ آخر میں بعض رسائل سے لکھنے والوں کے ناموں کی ایک طویل فہرست پیش کر دو تاکہ ع

باغباں بھی خوش رہے اور خوش رہے صیاد بھی

لیکن اس فارمولے سے باغباں اور صیاد میں فرق نہیں ہوتا۔ تو کیا پھول اور کانٹے میں بھی تمیز نہیں ہو سکتی

ہم تو سمجھتے تھے کہ تنقید کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک وقت میں کم سے کم نئے یا پرانے لکھنے والوں کی تخلیقات پیش نظر رکھ کر ان کے حسن و قبح پر بحث کی جائے تاکہ لکھنے والوں کی بھی رہنمائی ہو۔ اور پڑھنے والوں کے ذہن بھی جلا پائیں۔ آج لکھنے والے ہی نہیں بلکہ ذہین پڑھنے والے بھی ہماری تنقیدوں سے دل برداشتہ ہو رہے ہیں۔ اس وقت ادیبوں کا فرض ہے۔ کہ وہ اپنے محترم نقادوں کی گمراہ کن روش پر مسلسل لکھیں۔ میرے خیال میں آج اُردو ادب کی تنقید کو گمراہی، انتشار اور جمود سے بچانا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو بھی مسلسل لکھنا چاہیے۔

کاش ہمارے فاضل نقاد یہ محسوس کر سکیں کہ ان کا کام ستائش و خوشامد کرنا یا انتقام لینا نہیں۔ تنقید کرنا ہے۔ اور تنقید میں ذاتی مراسم اور اغراض سے بلند ہو کر "نام" کی بجائے "کام" کو مدِ نظر رکھنا چاہیے۔ کیونکہ ادب کا نقاد تھانے دار نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسا منصف ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں ہر وقت انصاف، توازن اور روشن دماغی کی ترازو رہتی ہے۔ اس کا کام گمراہی سے بچانا ہے نہ کہ خود گمراہ ہونا

ادبِ لطیف کی جسمانی صحت دن بدن گرتی کیوں جا رہی ہے؟ آپ اسے ہیچ ہیچ "روح" ہی نہ بنائیے۔ رُوح کے ساتھ ساتھ حسین اور صحت مند جسم بھی ضروری ہوتا ہے۔ نیا سرورق دیکھ کر مرحوم "عالمگیر" یاد آ گیا۔ کہیں آپ "ادبِ لطیف" کے کان میں یہ تو نہیں کہہ رہے ع

دو پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

افکار و مسائل

مرتب

پاکستان کے علمی و ادبی ادارے:-

ہم نے ان صفحات میں ہمیشہ اس بات کی شکایت کی ہے کہ ہماری حکومت کو ملک کی ثقافتی سرگرمیوں اور تہذیبی ترقی سے بہت کم سروکار ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ فنونِ لطیفہ کا وہ قیمتی اثاثہ جسے سالہا سال کی مسلسل جدوجہد نے زندگی بخشی ہے۔ کس مپرسی کے عالم میں ختم ہوتا جا رہا ہے۔ یہ شکایت پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے مگر آج ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے ہاں جن اداروں کو برسرِ اقتدار طبقے کا مالی تعاون حاصل ہے۔ وہ اب تک کیا کر سکے ہیں اور کیا کر رہے ہیں، اس مسئلے پر غور کرتے وقت ہمارے لیے سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ جو ادارے مستقلاً مالی امداد لے رہے ہیں وہ کبھی ایسی ششماہی یا سالانہ روداد، شائع نہیں کرتے جن کے مطالعے سے ان کے عملی نتائج کا علم ہو سکے۔ اس لیے ہمیں صرف ظواہر پر تکیہ کرنا پڑا ہے اور عموماً ان معلومات کو مدِنظر نہیں رکھا جو سنی سنائی باتوں سے حاصل ہوئی ہیں! — کیا اچھا ہو جو یہ ادارے سالانہ رپورٹ پیش کر دیا کریں جس میں ان کی سال بھر کی علمی و ادبی تگ و دو کا احاطہ کیا گیا ہو یہ ادارے پبلک ادارے ہیں، پبلک ان کی امداد کرتی ہے اس لیے پبلک کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ دیکھے کہ اس کے گاڑھے خون کی کمائی کس طرح خرچ کی جا رہی ہے اور اس کا نتیجہ کیا برآمد ہو رہا ہے

ان اداروں میں ہماری نظر سب سے پہلے انجمن ترقی اُردو پر پڑتی ہے۔ اس ادارے کو قائم ہوئے پچاس سال سے زائد مدت گزر چکی ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ انجمن نے اُردو زبان اور ادب کی ترقی کے سلسلے میں نہایت اہم، بڑی قابلِ قدر اور بہت شاندار خدمات انجام دی ہیں، انجمن کی طویل زندگی اپنی جدوجہد کے اعتبار سے ہماری تاریخِ ادب کا بڑا تابناک باب ہے، قیامِ پاکستان کے بعد بھی اس ادارے نے اُردو کالج قائم کر کے بڑا شاندار کارنامہ انجام دیا ہے مگر ہم کچھ یوں محسوس کرتے ہیں جیسے ہمارا یہ عظیم الشان ادارہ اپنی روایات برقرار رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا، گزشتہ چند برس میں انجمن نے اول تو بہت کم تعداد میں کتابیں شائع کی ہیں اور جو کتابیں منظرِ عام پر آئی بھی ہیں ان کا ادبی معیار بھی کوئی اتنا بلند نہیں ہے، دیکھنے والے کہتے ہیں کہ انجمن کے داخلی معاملات نے ایک ایسی صورت اختیار کر لی ہے جو بڑی تشویش ناک ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں مبالغہ ہو لیکن ایک بات ہمارے لیے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوئی تھی — اور وہ بات یہ تھی کہ اب کے حکومت نے انجمن کو امداد نہیں دی تھی — یہ حکومت کی زیادتی تھی — بعد میں حکومت کی جانب سے جو بیان شائع ہوا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ انجمن حساب کتاب دکھانے پر رضامند نہیں ہے۔ حکومت اگر امداد دیتی ہے تو وہ یہ بھی دیکھتی ہے کہ اس امداد کو کہاں کہاں خرچ کیا گیا ہے حکومت اس کی مجاز ہے اور انجمن کا اس معاملے میں عدمِ تعاون — مناسب معلوم نہیں ہوتا اور یہی چیز ہمارے لیے قدرے تشویش کا سامان بھی مہیا کر دیتی ہے!

اپنی انجمن کے ساتھ ساتھ جب ہم انجمن ترقی اُردو (ہند) کی کارگزاریوں کا سرسری جائزہ لیتے ہیں تو اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہمارے پڑوسی ملک کی انجمن اپنی روایات برقرار رکھنے میں ہمارے ملک کی انجمن سے کافی آگے ہے، اس انجمن نے اُردو کو علاقائی زبان تسلیم کروانے کے لیے یو۔ پی۔ میں لاکھوں لوگوں کے دستخط حاصل کر کے جس جوشِ عمل اور حسنِ تنظیم کا مظاہرہ کیا تھا وہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے، انجمن کی تازہ مطبوعات

ہماری مطبوعات سے بہتر ہیں اور یہ انجمن ایک جامع تاریخ اردو ادب بھی مکمل کر رہی ہے ــــ یہ کارنامہ اردو سے محبت کرنے والوں کا ایک پرانا خواب ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہماری انجمن کے راستے میں سنگ ہائے گراں حائل ہیں، قدم قدم پر حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور کام کرنے والوں کو ہر لمحہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ــ مگر یہ سب کچھ دوسری طرف بھی ہے، کام کرنے والوں کا راستہ ادھر بھی صاف نہیں ہے، حوصلہ شکنی کا سامان وہاں بھی ہے ــــ اور دشواریوں کا مقابلہ ان لوگوں کو بھی کرنا پڑتا ہے ــــ لیکن

- ہمسایہ ملک میں کام زیادہ ہو رہا ہے۔
- طے شدہ پروگرام کے مطابق ہو رہا ہے ــــ اور ــــ
- بہتر انداز میں ہو رہا ہے۔

یہاں گھر کی مرغی دال برابر والی بات نہیں ہے ــــ بات انصاف کے تقاضے کی ہے، حقیقت بینی اور حقیقت فہمی کی ہے، جذباتی زاویۂ فکر وقتی طور پر خوش تو کر سکتا ہے ــــ حقیقت جھٹلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ہمارے دل میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی بڑی عزت، بڑا احترام ہے ان کی ایثار پیشگی کا ہمیں اعتراف ہے مگر بابائے اردو کی انجمن ترقی اردو ــــ اردو کی ترقی کے لیے بہت کم کام کر رہی ہے اور یہ صورتِ حال مایوس کن ہے۔

اس مرتبہ ہم افکار و مسائل کے باب میں پاکستان کے صرف ایک ادارے کے متعلق اظہارِ خیال کر سکے ہیں ــ آئندہ شمارے میں دوسرے اداروں کا ذکر کریں گے ؏

جائزے

مرتّب

دو شعری مجموعے :- پچھلی کچھ مدت میں ہمارے یہاں جتنے شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں انھیں دیکھ کر بڑی آسانی سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے ناشر شعروں کی کتابیں بڑے اہتمام سے شائع کر رہے ہیں اور یہ کتابیں آرائش وجمال کے ساز و سامان کے اعتبار سے نثر کی کتابوں پر عموماً فوقیت رکھتی ہیں اس وقت بھی جو دو کتابیں ہمارے پیش نظر ہیں بڑے سلیقے سے اشاعت پذیر ہوئی ہیں اور ان کی صورت پذیری میں پڑھنے والوں کی جمالیاتی حس کا بطورِ خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ان میں سے پہلا مجموعہ احمد فراز کے کلام کا ہے جس کا نام ہے "تنہا تنہا" اور اس کا سائز ۲۰×۳۰ ہے، نظم کی کتابوں کا عام طور پر یہی سائز مقبول ہو رہا ہے۔ احمد فراز نظریاتی اعتبار سے اس کارواں کا رفیق سفر ہے جو نئی منزل صبح کی تلاش میں مسلسل سرگرداں ہے اور جس کی نگاہیں نئے افق پر جمی ہیں۔ فراز کے پاس کہنے کے لیے بھی بہت کچھ ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس "بہت کچھ" کو کس طرح بہت اچھے انداز میں کہا جاسکتا ہے۔ اس کے افکار میں گہرائی اور وسعت ہے الفاظ میں ترنم اور نغمگی ہے اور پھر اس کے اندر ارضیت کے ساتھ ساتھ نئے نئے ستاروں کی طرف ہاتھ بڑھانے کا حوصلہ بھی ہے۔ اس کی خاص شعری خصوصیت اس کے انداز کی شگفتگی ہے۔ غزل ہو یا نظم اس کے یہاں ہر قدم پر تر و تازگی کا احساس زندہ رہتا ہے۔ فراز کی اس خوبی کو دو لفظوں میں کہنا چاہیں تو اس کے لیے شگفتہ بیانی کی ترکیب بڑی موزوں رہے گی۔

فراز نے اپنے اس مجموعے میں بعض بڑے معرکے کی نظمیں دی ہیں۔ مگر ہم سمجھتے ہیں ابھی ان کے ہاں کہیں کہیں نشیب و فراز کی کیفیت بھی نظر آجاتی ہے اسے ذہن کی ناپختگی تو نہیں البتہ بے احتیاطی ضرور سمجھا جاسکتا ہے اگر وہ اشاعت سے پیشتر تمام اشعار کا ذرا سختی کے ساتھ جائزہ لے لیتے تو وہ چند خامیاں بھی دور ہو جاتیں جو کہیں کہیں نگاہوں میں کھٹکنے لگتی ہیں۔ ان چند معمولی خامیوں سے قطع نظر فراز کا کلام موجودہ نسل کے ایک بڑے ذہین، منفرد اور بالغ نظر و بالغ فکر شاعر کا کلام ہے اور "تنہا تنہا" کا شاعر خوب سے خوب تر لکھنے کی برابر کوشش کر رہا ہے۔

اس مجموعے کی ایک اور چیز بھی کھٹکتی ہے — سب سے آخر میں "فنکاروں کے نام" کے عنوان سے جو نظم درج ہے وہ غیر مکمل ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں۔ "نظمی" کے بعد فراز کی یہ دوسری مقبول ترین نظم ہے اور ادبِ لطیف کے سالنامے میں چھپ کر کافی بلند مقام حاصل کر چکی ہے۔ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں یہ کوتاہی نہ رہنی چاہیے۔

"تنہا تنہا" کو بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ ہر صفحہ رنگین ہے۔ ٹائپ بڑا خوبصورت اور سرورق خیال انگیز۔ قیمت ۴/۰/۰ روپے

دوسری کتاب عدم کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ نام ہے "رم آہو" - یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ پچھلے چند سال میں عدم سے بڑھ کر کسی اور شاعر کی زیادہ کتابیں نہیں چھپیں۔ عدم پرگو شاعر ہیں۔ اور سال میں ان کے دو تین مجموعے ضرور تیار ہو جاتے ہیں۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے غالباً میر تقی کے بارے میں کہا تھا کہ — "بلندش غایتے بلند و پستش خیلے پست" یہ بات قریب قریب عدم کی شاعری کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے۔ ان کے بعض اشعار تو تیر و نشتر کی حیثیت رکھتے ہیں مگر انہی تیروں اور نشتروں میں گھاس کے تنکے بھی نظر آجاتے ہیں۔ اس کے لیے انتخاب کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ عدم روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے تجربات کے شاعر ہیں۔ اور جہاں کہیں بھی وہ ان تجربات کو شاعرانہ آہنگ کے ساتھ لکھتے ہیں، پڑھنے والا تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ مگر کبھی کبھی یہ تجربات صرف منظوم صورت اختیار

کر کے ہی رہ جاتے ہیں۔ علام کے ہاں تصنع نام کو نہیں۔ بے تکلفی سے کہنے کا انداز ہر جگہ نمایاں رہتا ہے

"رم آہُو" بھی خوبصورت گٹ اپ میں پیش کیا گیا ہے۔ قیمت ۲/۸/۰ روپے

یہ دونوں مجموعے ملک سنز، ریلوے روڈ، سیالکوٹ نے شائع کیے ہیں!

(م - و)

○

ایک ناولٹ:- انور سجاد نے رگِ سنگ کے نام سے ایک ناولٹ لکھا ہے جو اس صنفِ ادب میں ان کی اولیں کوشش ہے۔ اس ناولٹ میں کوئی باقاعدہ پلاٹ یا واقعات میں کوئی منطقی تسلسل موجود نہیں، اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہونہار مصنف نے ان نوجوانوں کے نفسیاتی کوائف واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جو موجودہ معاشرے سے بیزار ہیں مگر جن کے سامنے کوئی راہِ عمل متعین نہیں اور جو جھوٹی خوشیوں کے حصول کی خاطر شراب و شباب کے دامن میں پناہ ڈھونڈتے ہیں، ناول نویس نے اس طبقے کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اپنے مشاہدے سے جو کچھ پایا ہے اُسے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اس کتاب کے صفحات پر پھیلا دیا ہے، انور سجاد نے ان محرکات پر بھی روشنی ڈالی ہے جنھوں نے ان گمراہ نوجوانوں کی ذہنی ساخت میں سب سے اہم حصہ لیا ہے اور جو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے چلے جاتے ہیں، رگِ سنگ سے جو لہو ٹپکا ہے اس کی روانی میں جہاں گمراہ لوگوں کے بھیانک تصورات کی سیاہی نظر آتی ہے، وہاں ان بکھرے ہُوئے خوابوں کی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے جو ماحول کی خوفناک چٹان سے ٹکرانے پر مجبور رہتے ہیں۔

مصنف نے بعض مقامات پر خطیبانہ رنگ اختیار کر لیا ہے جو مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں کتاب میں زبان اور کتابت کی غلطیاں بھی ہیں۔ آئندہ اشاعت میں مصنف کو اس طرف ضرور توجہ کرنی چاہیئے۔

انور سجاد نے یہ ناولٹ لکھ کر اپنی صلاحیت کا قابلِ قدر ثبوت دیا ہے اور ہمیں توقع ہے ان کے بعد کے نقوش پہلے نقش سے بہتر ہوں گے۔ کتاب کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔ گوشۂ ادب، چوک انار کلی، لاہور نے شائع کی ہے۔

(م - ا)

○

بچوں کی تین خوبصورت کتابیں:- حال ہی میں بچوں کے لیے تین ایسی کتابیں شائع ہوئی ہیں جنھیں پیشکش کے لحاظ سے انگریزی کی خوبصورت سے خوبصورت کتاب کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے دو کتابوں میں تو دلچسپ کہانیاں درج ہیں اور تیسری کتاب کا تعلق حرارت سے متعلق مفید معلومات سے ہے۔

"بڑا ریچھ" لینڈ وارڈ کی تصنیف ہے۔ ترجمہ اشرف صبوحی دہلوی نے کیا ہے اور بڑی عام فہم رواں دواں زبان میں ہے، کہانی کے ہر واقعے کو بڑی عمدگی، خوبی اور نفاست کے ساتھ مصور کیا گیا ہے، کہانی ایک ریچھ کی ہے مگر اس پردے میں بچوں کو نفسیاتی طور پر بہادری، جرأت اور اولوالعزمی کا سبق دیا گیا ہے ——— قیمت ۲/۸/۰ مکتبہ جدید، چوک انار کلی، لاہور سے حاصل کریں۔

دوسری کتاب کا نام خزانے کی تلاش ہے۔ مصنف ولفرڈ۔ ایس۔ رونسن ہیں اور مترجم اردو کے مشہور انشاپرداز شبلی بی کام ——— یہاں ایک ایسے غریب لیکن بلند ہمت لڑکے "پنٹو" کے حیرت انگیز معرکوں کا حال بیان کیا گیا ہے جو فیروزے کی تلاش میں گھر سے نکل جاتا ہے اور کامیاب ہو کر لوٹتا ہے۔ ترجمہ بہت اچھا ہے۔ یہ کتاب بھی مصور ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ عالمگیر کتاب گھر ایبک روڈ لاہور سے طلب کریں۔

آخری کتاب ہے "آؤ معلوم کریں" یہ بھی ترجمہ ہے اور ترجمہ کرنے والے صاحب ہیں محمد مظفر الدین۔ اس کتاب میں ہوا کی مختلف صورتوں، ہوا کی

کارگزاری، اور ہوائی جہاز کے پیچیدہ نظام کے متعلق ابتدائی معلومات بڑے اچھے طریقے پر بیان کر دی گئی ہیں اور ساتھ ساتھ تصویریں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ اسے احسن برادرز، چوک انار کلی، لاہور نے شائع کیا ہے۔

(م۔ و)

○

شخصیت کی نفسیات:۔ آسکر وائلڈ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ انسان کی شخصیت بڑی پراسرار چیز ہے یقیناً اس کے پراسرار ہونے میں کوئی شک نہیں مگر ہمارے نفسیاتی علوم نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ہم شخصیت کے ہر گوشے میں جھانک سکتے ہیں اور معلوم کر سکتے ہیں کہ فلاں شخصیت کا مزاج کیا ہے اور اس کے عناصر ترکیبی کیا ہیں، پروفیسر عبدالحی علوی نے اس موضوع پر بھرپور روشنی ڈالی ہے، کتاب کا نام شخصیت اور اس کا مطالعہ ہے، پروفیسر صاحب موصوف نے اس کتاب کے سات مکمل، جامع اور بسیط ابواب میں شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو موضوعِ بحث بنایا ہے اور شخصیت کے متعلق ہماری معلومات میں بڑا اضافہ کر دیا ہے، کتاب ٹائپ میں چھپی ہے اور یہ کوشش خاص طور پر قابلِ قدر ہے۔ صفحات ۱۸۰ قیمت ۳/۰/۰ ۔ کتاب منزل، کشمیری بازار، لاہور سے حاصل کریں۔

(م۔ و)

○

ڈی، ایچ، لارنس کا ایک ناولٹ:۔ ڈی ایچ لارنس دنیا کے ان مصنفوں میں شامل ہے جن کی تخلیقات اخلاق احتساب میں جکڑے رہنے کے باوجود بہت مقبول ہیں: عریانی اور لارنس، کو اس کے اپنے ملک انگلینڈ میں لازم و ملزوم سمجھا گیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس مصنف نے جتنی مقبولیت اپنے ملک اور اپنے ملک کے باہر حاصل کی وہ بہت کم مصنفوں کے حصے میں آتی ہے، حال ہی میں اس کے ایک ناولٹ کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ نام ہے "کپتان کا گڈا" اور اس کا ترجمہ سیدہ نسیم ہمدانی کی کاوش کا نتیجہ ہے، نسیم صاحبہ نے ترجمے میں کافی شہرت حاصل کر لی ہے، اس سے پیشتر وہ بالزاک اور میتھیل دامفورن کے تین ناولوں کا بھی ترجمہ کر چکی ہیں۔ ترجمہ بہت کامیاب ہے، کسی جگہ بھی الجھن کا احساس نہیں ہوتا۔

ناول ٹائپ میں چھپا ہے۔ نیا ادارہ کا یہ اقدام قابلِ قدر ہے یہ اشاعتی ادارہ اردو پڑھنے والوں کو ٹائپ سے مانوس کرنے کی مسلسل کوشش کر رہا ہے۔ یہ وقت کی ایک نہایت اہم ضرورت ہے۔ کاش دوسرے ادارے بھی اس طرف توجہ کر سکیں، اس ناولٹ کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے، ناشر نیا ادارہ' لاہور

○

(م۔ ا)

اثم مرزا کا ناول:۔ نیو پبلشرز نے اثم مرزا کا ایک ناول "پیار بیوپار" کے نام سے بڑی نفاست کے ساتھ شائع کیا ہے، ناول معاشرتی ہے اور اس موضوع کے گرد گھومتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں پیار کی حیثیت کیا ہے اور جب پیار بیوپار کے سامنے آجاتا ہے تو جیت کس کی ہوتی ہے۔

یہ ناول مصنف کی اولین کوشش ہے اور اس پہلی کوشش ہی میں انہوں نے موضوع کو فنکارانہ انداز میں گرفت میں لینے کا کافی اچھا مظاہرہ کیا ہے، قیمت ۳/۰/۰ روپے اگٹ اپ اچھی خاصی، صفحات ۲۰۸، نیو پبلشرز، مصری شاہ، لاہور